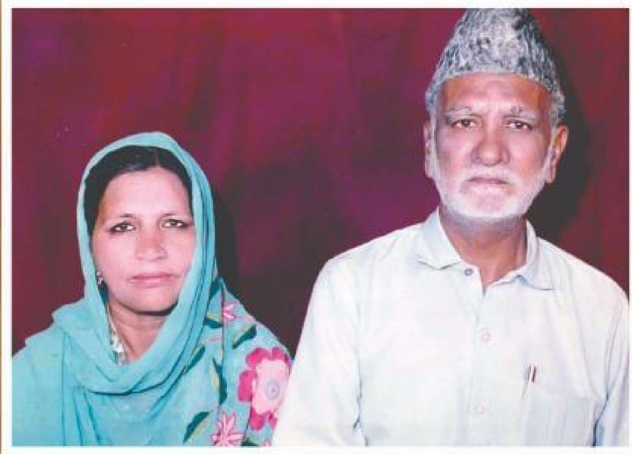


ابا جی اور امی جی



حیدر قریشی

ابا جی اور امی جی

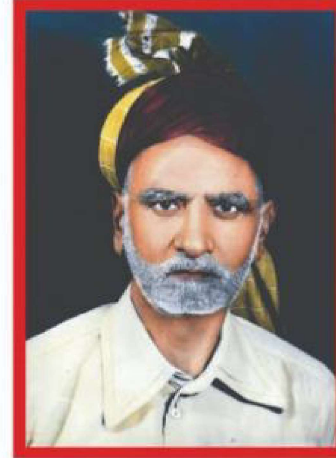
حیدر قریشی



ABBA JI AUR AMMI JI

Compiled By

HAIDER QURESHI



امی جی کی شادی کم عمری میں ہوئی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں، تب ابا جی کی عمر تقریباً ستائیس برس تھی۔ ابا جی سرائیکی تھے، امی جی پنجابی۔ عمروں اور کلچر کے واضح فرق کے باوجود میاں بیوی کی محبت کا کمال یوں ظاہر ہوا کہ ابا جی دیکھنے میں پنجابی لگتے تھے اور امی جی سرائیکی لگتی تھیں۔ دونوں نے خود کو ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ من تو شدم تو من شدی والا حال تھا۔

.... ابا جی کی "وِل پاور" کے کئی کرشمے دیکھنے کے باوجود امی جی نے انہیں بزرگ تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ اس معاملہ میں ہمیشہ ہی ابا جی کو چھیڑتی رہیں اور ہار کر بھی ہار نہیں مانتی رہیں۔

امی جی کے خاکہ "مائے نی میں کنوں آکھاں" سے اقتباس

M.M. PUBLICATIONS
3097, Katra Nisar Baig, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi - 110006 (INDIA)
Mob. : +919999074579, +919013119640
E-mail : mmp.delhi06@gmail.com
Resi. : 5095, 4th Floor, Phatak Bana, Sirki Walaan, Delhi - 110006 (INDIA)


978- 93- 82589- -

فَاذکُرُوا اللہَ کَذِکرِکُم اٰبَآءَ کُم اَو اَشَدَّ ذِکرًا ط

(سورۃ البقرہ : 200)

’’اللہ کو اسی طرح یاد کرو جیسے اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ‘‘

ابّا جی اور امّی جی

مرتّب

حیدر قریشی

ایم ایم پبلی کیشنز

"Abba Ji Aur Ammi Ji" habe ich in Gedanken meiner verstorbenen Eltern geschrieben. Dies ist ein Familienbuch welches nur für die Familie und Freunde ausgestellt wurde. In Deutschland ist das Buch kostenlos erhältlich.
(Haider Qureshi)

ABBA JI AUR AMMI JI
Compiled BY: Haider Qureshi
Year of 1st Edition 2020
ISBN 978-93-82589-42-6
Price in India Rs.100/-

نام کتاب	:	ابّا جی اور امّی جی
مرتب	:	حیدر قریشی
اشاعت	:	جنوری2020
سرورق	:	عبیدالرحمٰن
مطبع	:	ربانی پریس، دہلی
قیمت انڈیا میں	:	ایک سو روپے

حیدر قریشی سے رابطہ کے لیے
E-mail
hqg786@gmail.com
WhatsApp
004915211950522

Published by
M.M. PUBLICATIONS
3094-97, Ground Floor, Kathra Nisar Baig
Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Mob.: +919999074579, +919013119640
E-Mail:mmp.delhi06@gmail.com

انتساب

ابّا جی اور امّی جی کے نام

حیدرؔ اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابّا بھی چل بسے، تری ماں بھی نہیں رہی

ابھی تو قول اپنے باپ کا ہم نے نبھانا ہے
ابھی اپنے مقدر کا کڑا بَن باس باقی ہے

یہ ساری روشنی حیدرؔ ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

فہرست

حیدرقریشی

پیش لفظ

ابّا جی اورامّی جی

ابا جی اورامی جی کے بارے میں یہ کتاب مرتب کرتے ہوئے میں اپنی زندگی کی ابتدا سے اب تک کے ہر دور سے گزرا ہوں۔رنگ برنگی یادیں۔۔۔دکھوں سے بھری زندگی کی ہنستی مسکراتی ہوئی یادیں مختلف کیفیات پیدا کرتی رہیں۔

امی جی کے بارے میں عام اورمعروف بات تو وہی ہے جو ہمارے عہد کی ساری ماؤں کے بارے میں کہی جاتی ہے کہ ماں کا کوئی نعم البدل نہیں اور جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔تاہم امی جی کا امتیازی وصف یہ رہا کہ انہوں نے بھیانک غربت کے دنوں میں بلکہ بھیانک غربت کے کئی برسوں سے گزرتے ہوئے ابا جی کے ساتھ اپنی محبت اور وفا کا رشتہ کبھی کمزور نہیں ہونے دیا۔اولاد کے لیے سراپا محبت اور شفقت۔انتہائی تنگ دستی کے جہنم سے گزرتے ہوئے بھی اپنے قدموں کی جنت کواولاد کے لیے ہمیشہ سرسبز وشاداب رکھا۔میں توان کی بچپن میں سنائی ہوئی لوری

''راج دُلارے۔۔۔

اومیری اکھیوں کے تارے میں توواری واری جاؤں''

کی محبت کی ڈوری سے ہمیشہ کے لیے بندھا ہوا ہوں۔13 جنوری کومیری سال گرہ ہو یا 22 جنوری کوامی جی کی سال گرہ ہو۔۔۔نمازاورقرآن پڑھنے کے بعد ناشتہ کرنے کے ساتھ میرے دن کی

ابتدا اسی لوری کو سننے سے ہوتی ہے۔پاکستان میں کوثر پروین کی آواز میں یہ لوری میں نے آڈیو کیسٹ کی ایک سائیڈ میں بار بار ریکارڈ کرالی تھی۔عرصے تک یہ کیسٹ کام آتی رہی۔پھر یوٹیوب کا دور آیا تو سننا مزید آسان ہو گیا۔سال گرہ کے دنوں کے علاوہ بھی کبھی امی جی زیادہ یاد آتی ہیں تو یہی لوری سننے لگتا ہوں۔عمر کے اس حصے میں،68 برس کا ہوکر بھی میری یہ عادت برقرار ہے۔

ابا جی کا معاملہ یوں ہے کہ میں نے خود میں اوران میں کبھی تفریق نہیں کی۔مجھے تفریق دکھائی ہی نہیں دیتی۔میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو ابا جی کو دیکھتا ہوں۔ابا جی کو دیکھتا ہوں تو اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔یوں امی جی سے میری محبت دوآتشہ ہو جاتی ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت سارے دعا گو اور بزرگ دیکھے ہیں لیکن مجھے ابا جی ہمیشہ سب سے زیادہ روشن روحانی بزرگ دکھائی دیئے۔کسی ایچ پیچ یا گول مول انداز کی بجائے ان کے متعدد صاف اورسیدھے سچے خواب ان کی کھری روحانیت کا ثبوت تھے۔اپنے بچوں اورقریبی احباب کے لیے دعا اور دم درود کا محدود سلسلہ بھی اسی روحانیت سے منسلک تھا۔یہ روحانیت انہیں شاید شدید غربت (اوروارث بیٹوں) کی شرط کے ساتھ ملی تھی اورانہوں نے اسے قبول کرلیا تھا۔اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ غربت کی شرط ابا جی کی زندگی تک تھی۔شاید انہوں نے بھی کہا ہو کہ میرے بعد میرے بچوں کو تنگ دست نہ رکھنا۔چنانچہ ابا جی اورامی جی کی وفات کے بعد ان کی ساری اولاد کے دن بدلتے گئے،بہتر سے بہتر ہوتے چلے گئے۔یہ سب ابا جی کے ذریعے ہی ہمیں ملا ہے۔

ابا جی روحانیت کے اسرار ورموز سے شناسائی کے باوجود عقلیت پسند بھی تھے۔ابا جی کہا کرتے تھے کہ قدرت کا نظام باقاعدہ قدرت کے اصول وضوابط کے مطابق چل رہا ہے۔کسی پیغمبر، ولی، اوتار سے معجزہ، کرامت کارونما ہونا بظاہر اچانک ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس کے عقب میں پورا طبیعاتی نظام ایک عرصہ سے اپنا عمل مکمل کر رہا ہوتا ہے۔گویا ابا جی طبیعات اور مابعد الطبیعات کے دوالگ الگ جہان ماننے کے باوجود اندر ہی اندر کہیں ان میں بڑا مربوط تعلق دیکھتے تھے۔چنانچہ ابا جی بعض مافوق لفطرت واقعات کی باقاعدہ عقلی توجیہ بھی بیان کیا کرتے تھے۔اورتو اور بعض توہمات کا بھی عقلی جواز پیش کیا کرتے تھے۔مثلاً ہمارے ہاں کہا جاتا تھا کہ شام کے

وقت ناخن نہیں تراشنے نہیں چاہئیں۔ابا جی اس کا جواز یہ بتاتے تھے کہ ہمارے بچپن میں بجلی تو تھی نہیں،شام کے وقت دیئے اور چراغ جلائے جاتے تھے۔نیم روشنی اور نیم تاریکی کی حالت میں ناخن تراشتے ہوئے زخم ہوسکتا تھا،اسی لیے شام کے بعد اس سے روکنے کی نصیحت کی گئی۔اب تو شام کے بعد دن سے زیادہ روشنی ہوجاتی ہے۔

ابا جی کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے حوالے سے کئی مافوق الفطرت واقعات کا میں خود گواہ ہوں۔میں نے ایسے واقعات لکھے بھی ہیں لیکن ایسے ہر واقعے کے ساتھ میں اس کی عقلی توجیہہ بھی بیان کر دیتا ہوں۔یقینی طور پر یہ عادت اور یہ رویہ مجھے ابا جی سے ہی وراثت میں ملا ہے۔ابا جی کی وفات کے تئیسویں روز ان کا کمرہ گلاب کی خوشبو سے بھر گیا تھا۔ میرے بیان کردہ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے منشا یاد نے لکھا تھا:

> ’’میں حیدر قریشی کا یہ بیان پڑھ کر تھوڑا سا پریشان ہوگیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ میں تو انہیں نہایت عقلی، ریشنل اور سائنسی سوچ کا حامل سمجھتا تھا یہ انہوں نے کرامتوں اور معجزوں کی کیا باتیں شروع کردی ہیں مگر جونہی میں نے آخری جملہ پڑھا،اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا—— لکھا تھا:
>
> ’’یہ خوشبو کیا تھی؟اتنی سی بات ہی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آنکھ خواب تخلیق کرسکتی ہے تو قوتِ شامہ بھی خوشبو تخلیق کرسکتی ہے‘‘

میں نے جب سے لکھنا شروع کیا ہے،جن مختلف اصناف میں لکھا ہے،ابا جی اور امی جی تب سے ہی میری تحریروں کو منور کرتے رہے ہیں۔وہ سارا لکھا ہوا جو مختلف کتابوں میں جا بجا بکھرا ہوا تھا،اب یک جا کیا ہے تو یہ ایک چھوٹی سی کتاب مرتب ہوگئی ہے۔

آخر میں مبارکہ کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے کہ فوت ہو جانے کے باوجود ’’حیاتِ مبارکہ حیدر‘‘ کی تکمیل کے وقت انہوں نے ہی مجھے یہ احساس دلایا کہ مجھے ابا جی اور امی جی پر یہ کتاب مرتب کرنی چاہئے۔سو اب یہ کتاب مکمل ہوکر،چھپ کر قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

لو أدركت والِديَّ او احدهما وانا فِی صلاةِ العِشاِ، وقد قرأت فِيها بِفاتِحةِ الكِتابِ ينادِينِی: يا محمد؛ لأجبته لبيک

شعب الايمان (284/10)، **مصنفات ا بی جعفر ابن البختری)**

ص: (210، **الموضوعات لابن الجوزی** . (85/3)

....

لو ادركت والِديَّ او احدهما، وقدِ افتتحت صلا ةالعِشاءِ، فقرات فاتِحة الكِتابِ فدعتنِی اُمِی تقول: يا محمد،لقلت لبيک.

البر والصلة لابن الجوزی)ص: 57..، **كنز العمال** . (470/16)

....

اگر میں اپنے والدین، یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو پاتا ، جبکہ میں عشا کی نماز شروع کر کے سورہ فاتحہ پڑھ چکا ہوتا،اور وہ مجھے پکارتے یا ماں مجھے پکارتی :اے محمد!تو میں (نماز توڑ کر) جواباً :لبیک کہتا۔

....

حیدر قریشی

برگد کا پیڑ

(ابا جی)

گلابوں کی مہک تھی یا کسی کی یاد کی خوشبو
ابھی تک روح میں مہکار کا احساس باقی ہے

باپ بیٹے کے مابین اوّلین تعارف کا کوئی واقعہ بیان کرنا اس لحاظ سے بے معنی سی بات ہے کہ یہ تعارف تو خون کے اجزا میں سے ڈھونڈ نکالنا بھی مشکل ہے۔ صدیوں پہلے ہم اپنے آباؤ اجداد کے لہو میں موجزن تھے۔ اپنی پیدائش سے پہلے میں ابا جی کے لہو میں رواں تھا تو ابا جی اپنی وفات کے بعد بھی میرے دل میں دھڑک رہے ہیں۔ اس کے باوجود شعوری سطح پر ابا جی سے میرا پہلا معانقہ اس وقت ہوا جب میری عمر تقریباً تین سال تھی۔ یہ واقعہ آج بھی میرے شعور میں ایک ہیُولے کی طرح موجود ہے۔ یوں تو ہر انسان اپنے بچپن میں فطرت سے بہت قریب ہوتا ہے لیکن مجھے بچپن میں فطرت سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ چنانچہ جیسے ہی موقعہ ملتا الاسٹک والی نیکر اور بٹنوں والی شرٹ اتار کر فطری لباس پہن لیتا۔ ایسا ایک موقعہ مجھے اُس وقت ملا جب امی جی سامنے والے گھر کی بُوا زیبو کے ہاں گئیں اور میں فطری لباس پہنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ رحیم یار خاں کے محلّہ قاضیاں سے (موجودہ) جدید بازار تک کئی پیچ دار رستوں سے نجانے میں کس طرح گزرتا چلا گیا۔ ابا جی وہاں اپنے ایک دوست ممتاز صاحب کی دوکان پر کھڑے تھے۔ میں جا کر ''ابوا''

کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ انہوں نے سمجھا کسی کا بچہ ہے جو خوامخواہ ان سے چمٹ گیا ہے۔ چنانچہ میرے معانقہ کے جواب میں انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر مجھے اپنے سے الگ کر کے پرے کر دیا۔ میں پھر ''ابوا'' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اس بار پھر انہوں نے دیکھے بغیر مجھے پرے دھکیل دیا اور میں اپنے حواس درست کئے بغیر تیسری بار پھر ''ابوا'' کہہ کر ان کی ٹانگوں سے معانقہ کرنے لگا۔ لیکن اب اس سے پہلے کہ ابا جی مجھے پھر پرے دھکیلتے ممتاز صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے حیران ہوتے ہوئے ابا جی سے کہا: قریشی صاحب! یہ تو حیدر ہے۔ اب جو اَبا جی نے پلٹ کر دیکھا تو میری میلی کچیلی، ننگ دھڑنگ حالت ہی میں مجھے اٹھا لیا۔ پھر سب کچھ بھول بھال کر گھر کی طرف چل دیئے۔ راستہ بھر بار بار مجھے خود سے لپٹاتے اور چومتے جاتے۔ گھر پہنچے تو وہاں میری گمشدگی پر کہرام برپا تھا، یہ ابا جی سے گویا شعوری سطح پر میرا پہلا تعارف تھا۔

ابا جی وضع دار انسان تھے۔ روایات سے محبت رکھتے تھے مگر زمانے کے ارتقا کی سچائی کو مانتے تھے۔ ۱۹۶۰ء تک پھندنے والی رومی ٹوپی پہنتے رہے۔ اس ٹوپی کو ترکی ٹوپی بھی کہتے تھے۔ پھر کلاہ کے ساتھ لنگی باندھنی شروع کی اور جناح کیپ بھی استعمال کرتے رہے۔ آج ابا جی کی ساری زندگی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے ان کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ، ایک آریا اور ایک عرب بیٹھا نظر آتا ہے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی ایام میں دراوڑ حاوی رہا۔ عالم شباب میں نواب بھاولپور تک رسائی حاصل کر کے انہیں بھاول نگر محکمہ پولیس میں محرر لگوایا گیا جب سارا سامان باندھ کر روانہ ہونے کا وقت آیا تو دادا جی نے دبی زبان سے کہا: بیٹا!۔ تو پھر جا رہے ہو؟۔ اچھا جاؤ، ویسے دل نہیں کرتا کہ جاؤ۔

ابا جی نے فوراً کہا: دل تو میرا بھی نہیں کرتا کہ جاؤں، اس لئے نہیں جاتا۔۔ یہ کہہ کر بندھا ہوا سامان کھول ڈالا۔

ابا جی نے یہ قصہ بڑے مزے لے کر ہمیں سنایا تھا اور پھر کہا تھا: بھئی ہم سرائیکی لوگ تو اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر ہی پردیسی ہو جاتے تھے۔ یہ واقعہ تقسیم برصغیر سے پہلے کا ہے۔ اگر ان پر ان کے اندر کا دراوڑ حاوی نہ ہوتا تو وہ کم از کم ایس پی کی حیثیت سے ریٹائر ہوتے۔۔ بعد

میں جب خراب حالات بار بار حملہ آور ہونے لگے تو یوں لگا جیسے دراوڑ مغلوب ہو گیا ہے اور ابا جی کے اندر کا آریا فاتح ہو گیا ہے۔ رحیم یار خاں والا گھر فروخت کیا گیا تو ابا جی کے چہرے پر کوئی کرب نہیں تھا۔ میں تب صرف دس برس کا تھا مگر وہ گھر آج بھی نہ صرف میرے نہاں خانۂ دل میں آباد ہے بلکہ مجھے جب بھی رحیم یار خاں جانے کا موقعہ ملتا ہے، اس گھر کو دیکھنے کے لئے ضرور جاتا ہوں اور وہاں دیر تک بچپن کی یادوں میں گھرا رہتا ہوں۔ خانپور والا گھر فروخت ہوا تو ابا جی کے چہرے پر کوئی اداسی نہ تھی۔ یوں ان کے اندر کا آریا فتح یاب ہو گیا۔ مگر دراوڑ مغلوب کہاں ہوا؟ اس نے بیوی بچوں کو دھرتی کا متبادل بنا لیا، ایک معمولی سی مدت کے علاوہ بیوی بچوں کو خود سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا۔

اندر کے آریا اور دراوڑ کی کشمکش سے بے نیاز ایک عرب درویش ہمیشہ ابا جی کے اندر موجود رہا۔ یہ درویش خواب بین، دعا گو اور صاحبِ کشف و کرامت تھا۔ عرب درویش کا کمال یہ تھا کہ نیل آرمسٹرانگ سے دس سال پہلے اس نے چاند کی سرزمین پر قدم رکھ دیا تھا۔ ابا جی نے ۱۹۵۹ء میں خواب دیکھا کہ وہ چاند کی سرزمین پر اترے ہوئے ہیں۔ وہاں کے پہاڑ دیکھنے میں ایسے لگتے ہیں جیسے راکھ کے ہوں اور پاؤں رکھتے ہی راکھ میں دھنس جائیں گے۔ لیکن ابا جی پہاڑ پر پاؤں رکھتے ہیں تو وہ پتھر کے ہی ہوتے ہیں۔

Rain Makers اور Rain Breakers کے چند قصے تو اب پڑھنے کو ملے ہیں۔ مگر ابا جی کی ''وِل پاور'' اور ''ارتکاز'' کا کرشمہ تو ہم نے خود دیکھا تھا۔ ابا جی اور امی جی میں ''بزرگی'' کے مسئلہ پر مذاق چلتا رہتا تھا۔ ابا جی نے کہا: اگر میں اللہ میاں سے دعا کر کے اسی وقت بارش کروا دوں تو میری بزرگی کو مان لو گی؟ ۔ رحیم یار خاں میں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بادلوں کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ اس لئے امی جی نے للکارتے ہوئے شرط منظور کر لی۔ ابا جی مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جب چھت سے نیچے آئے، چاروں جانب سے گھنگھور گھٹائیں اُمڈی چلی آ رہی تھیں۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ لیکن امی جی نے ابا جی کی بزرگی کو نہیں ماننا تھا نہیں مانیں۔

مریضوں پر دم کرنا اور کسی کی خاص غرض کے لئے خصوصی دعا کرنا ان کی روحانیت یا وِل پاور کا عام سا کرشمہ تھا۔ میری ایک بہن زبیدہ کو جب بھی بخار ہوا اور دوا سے فرق نہیں پڑا، ابا جی نے اسے بھینچ کر گلے سے لگایا اور وہ ٹھیک ہو گئی۔ میرے نزدیک ایسے متعدد واقعات کے باوجود ابا جی کی سب بڑی کرامت یہ تھی کہ انہوں نے دکھوں سے بھری ہوئی زندگی کو ہنسی خوشی گزار لیا۔ کلاتھ مرچنٹ سے ٹیلر ماسٹر تک کا تکلیف دہ سفر طے کیا۔ پھر شوگر مل میں نوکری کر لی اور مجھے بھی شوگر مل میں جھونک دیا۔ جے سنز شوگر ملز خانپور کے جنرل منیجر عزیز حسین کی بیگم بڑی نیک دل خاتون تھیں (اگر ابھی تک زندہ ہیں تو اللہ انہیں مزید زندگی عطا کرے) ابا جی کا بے حد احترام کرتی تھیں۔ اپنے بہت سے خانگی معاملات ابا جی کو بتا کر ''دعا'' اور ''دوا'' دونوں کے لئے کہتیں۔ بیگم عزیز حسین کی نیکی کے سبب مجھے پندرہ (سولہ) برس کی عمر میں شوگر مل میں مزدوری مل گئی۔ میں نے اپنی زندگی کے بے حد قیمتی انیس سال اس شوگر مل میں برباد کئے۔ بیگم عزیز حسین کی نیک نیتی اور نیکی کے باوجود مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے میرے لئے نیکی نہ کی ہوتی تو میں زیادہ بہتر حالت میں ہوتا۔

شوگر مل کی ملازمت کے حوالے سے ہی یاد آیا کہ ملز انتظامیہ کے مزدور دشمن رویے کے باعث مجھے ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑا۔ ملز میں تصادم ہوا۔ بعض اہم افسروں کی ٹھیک ٹھاک پٹائی ہوئی۔ مقدمات بنے۔ اسی دوران مجھے بار بار دھمکیوں کے ساتھ خوشنما آفرز بھی ہوئیں مگر میں جوش جوانی اور بغاوت کی دُھن میں ہر آفر کو ٹھکراتا چلا گیا۔ ایک مرحلے پر ابا جی سے بھی کہا گیا کہ مجھے مفاہمت کے لئے راضی کریں۔ ابا جی نے مجھے بتایا کہ مجھے اس طرح کہا گیا ہے مگر تم جو فیصلہ اپنے طور پر کرنا چاہو، وہی کرو۔ میں نے کہا کہ اگر آپ مفاہمت کا حکم دیتے ہیں تو میں تیار ہوں۔ مگر انہوں نے کہا میں ایسا کوئی حکم نہیں دوں گا۔ تم خود فیصلہ کرو گے اور جو بھی فیصلہ کرو گے وہی درست ہوگا۔ چنانچہ میں نے مفاہمت کی بجائے بغاوت کا فیصلہ کیا۔ اس واقعہ سے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ابا جی اپنی وضع داری کی روایت پر تو قائم تھے مگر میرے باغیانہ رویے کو وہ بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کا لازمی تقاضا سمجھتے تھے۔ اسی لئے مجھے اس

سے روکنے کے بجائے انہوں نے بالواسطہ میری حوصلہ افزائی کی۔ جب ہماری یونین کو معطل کرادیا گیا تب ہم سے ملنے والے ہر مزدور سے باز پرس کی جاتی تھی مگر ابا جی کی اپنی شخصیت اتنی مضبوط تھی کہ نہ صرف انہیں ملز انتظامیہ کی طرف سے تنگ نہیں کیا گیا بلکہ ان کا اسی طرح احترام کیا جاتا رہا جیسا میری بغاوت سے پہلے ہوتا تھا۔

ابا جی بتاتے تھے کہ ہمارے خاندان میں کئی پشتوں سے بیٹوں کی کمی چلی آ رہی تھی۔ ایک بزرگ کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔ان بیٹوں میں سے ایک کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔ان میں سے بھی ایک کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔میاں میر محمد کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے۔میاں سعید بے اولاد رہے۔میاں غوث محمد کے ہاں ایک بیٹا ہوا مگر اگلے مرحلے میں ان کی نسل بھی ختم ہوگئی۔میاں اللہ رکھا کے ہاں دو بیٹے ہوئے، بابا جی اور ابا جی۔۔بابا جی کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور ابا جی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

ابا جی نے دو شادیاں کیں۔پہلی بیوی عزیز بی بی نے اس الزام کی بنیاد پر عدالت کے ذریعے طلاق لی کہ یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔پھر ابا جی کی شادی ہماری امی جی سے ہوئی اور یکے بعد دیگرے دس بچے پیدا ہوئے۔پانچ بیٹے، پانچ بیٹیاں۔۔عزیز بی بی نے دوسری جگہ شادی کر لی مگر اولاد سے محروم رہی۔

ایک دفعہ بوا حیات خاتون ہماری چھوٹی بہن بے بی کو لے کر ایک رشتہ دار کے یہاں گئیں۔وہیں ابا جی کی پہلی بیوی آ گئی۔بے بی کو دیکھتے ہی چونکی۔اس کے استفسار پر بوا حیات خاتون نے بتایا کہ قریشی غلام سرور کی بیٹی ہے۔اسی وقت بے بی کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔ ابا جی کی اولاد کی تفصیل پوچھی۔بوا حیات خاتون نے تفصیل بتادی۔سن کر سارے بچوں کو درازیٔ عمر کی دعائیں دینے لگی اور پھر حسرت سے کہنے لگی مجھے میری زیادتی کی سزا مل گئی ہے۔۔چند دنوں کے بعد ابا جی کی پہلی بیوی کی طرف سے کھانے کی چند اشیاء کا تحفہ ہمارے گھر آیا۔مگر ابا جی نے ساری چیزیں تلف کرا دیں۔کسی کو چکھنے نہیں دیں ان کا خیال تھا کہ ان اشیاء پر کوئی منفی قسم کا دَم کیا گیا ہے۔پہلی بیوی کی بے وفائی کے بعد ابا جی کی امی جی سے شادی ہوئی تو دونوں کی عمروں

میں بارہ سال سے زائد کا فرق تھا مگر اس بُعد نے محبت میں اضافہ کیا۔ابا جی اور امی جی کی محبت اور خوشگوار ازدواجی زندگی سارے خاندان کے لئے آج بھی ایک مثال ہے۔ایک وقت تھا کہ ہمارے عزیزوں میں ابا جی کا گھر سب سے زیادہ خوش حال تھا، پھر وہ وقت آیا کہ ابا جی کا گھر انتہائی غربت کا شکار ہو گیا۔بے حد قریب رہنے والے عزیز دور ہو گئے مگر ابا جی کے مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا۔ابا جی بے حد قناعت پسند تھے مگر انہوں نے ہمیں کبھی قناعت کا درس نہیں دیا۔ دراصل وہ اس لئے سارے دکھ خوشی خوشی برداشت کر رہے تھے کہ پچھلی کئی پشتوں سے ”پل صراط“ پر چلتے ہوئے ان کے خاندان کو پانچ بیٹوں کو سنبھالا مل گیا تھا۔حالانکہ یہ پانچوں بیٹے ان کے کسی کام نہ آسکے۔نہ کوئی خدمت کرنے کا اہل ہو سکا نہ کوئی خدمت کر سکا۔ان کی اپنی ساری زندگی ہی مشقت کرتے گزر گئی۔۔۔۔۔ابا جی کو کبھی کبھی غصہ بھی آتا اور یہ غصہ عام طور پر گھر کے گھڑوں اور برتنوں پر اترتا تھا۔لیکن جب شام کو ابا جی گھر آتے، ان کے ایک ہاتھ میں نیا گھڑا اور دوسرے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کے ہار ہوتے اور جھگڑا ختم۔

۱۹۵۰ء میں ابا جی اچانک بیمار ہوئے تھے۔اس علالت میں عجیب و غریب قسم کے دورے پڑتے تھے۔بابا جی کے بیان کے مطابق ابا جی کو چار چار پانچ پانچ کڑیل جوانوں نے دبایا ہوتا تھا مگر ابا جی اس طرح اٹھ بیٹھتے کہ انہیں دبانے والے لڑھکتے ہوئے اِدھر اُدھر جا پڑتے۔ابا جی نے اس سلسلہ میں جو احوال سنایا، اس کے مطابق ان کے اوپر ایک بہت بڑا فانوس نصب تھا، حالانکہ تب ہمارے گھر میں بجلی ہی نہیں آئی تھی۔اس فانوس سے سبز رنگ کی روشنی نکلتی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔اسی روشنی کے ذریعے ان کی بہت سے بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔ابا جی کے بقول ایک مرحلے پر انہیں خود علم ہو گیا تھا کہ ان کی جان نکل رہی ہے۔ٹانگوں سے بالکل جان نکل چکی تھی مگر پھر انہیں دنیا میں مزید (۳۶ سال) جینے کی اجازت مل گئی۔ابا جی کی زندگی کی یہ سنگین بیماری، جس کے باعث سارے عزیز ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے حقیقتاً کوئی بیماری تھی یا کوئی روحانی تجربہ تھا، میں اس بارے میں تو کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا تاہم بعد میں ان کی زندگی میں خواب بینی، دم درود اور کشوف کا جو سلسلہ نظر آتا ہے وہ اسی تجربے سے ہی مربوط محسوس ہوتا ہے۔واللہ اعلم!

میری پیدائش سے چند ماہ پہلے ابا جی نے یکے بعد دیگرے دو خواب دیکھے تھے۔ پہلا خواب یہ تھا کہ ایک بڑا اور گھنا درخت ہے جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ابا جی اس درخت کے اوپر عین درمیان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ خواب سن کر ابا جی کے ایک دوست روشن دین صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا جو.....

دوسرا خواب یہ تھا کہ لمبے لمبے قد والے بہت سارے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ بلند کرکے ''حیدر۔۔حیدر'' کے نعرے لگا رہے ہیں۔ ان دونوں خوابوں کے چند ماہ بعد میری پیدائش ہوئی۔ ابا جی نے اپنے مرشد کو خط لکھا کہ بیٹے کا نام تجویز فرما دیں۔ مرشد کو ابا جی کے خواب کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے حیدر بنا دیا۔ مگر ابا جی کے دونوں خوابوں کی تعبیر کا ابھی تو دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔ شاید حسنِ اتفاق تھا کہ میں پیدا ہو گیا اور حیدر نام رکھا گیا۔

میں بچپن میں شرارتیں بہت کرتا تھا۔ دوسروں کو ڈرانے میں مزہ آتا تھا۔ اسی وجہ سے بچپن میں ابا جی سے بڑی مار کھائی۔ سب سے زیادہ مار بھی میں نے کھائی اور ابا جی کی توجہ بھی سب سے زیادہ مجھے ملی۔ یہ ابا جی کی ذاتی توجہ ہی تھی جس کے باعث اسکول میں داخلہ کے وقت مجھے کچی، پکی کی بجائے براہ راست دوسری جماعت میں داخل کر لیا گیا۔ شادی کے بعد بھی ایک دفعہ ابا جی سے تھپڑ کھایا۔ یوں تو والدین کی محبت ساری اولاد کے لئے یکساں ہوتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ابا جی کو آپی سے اور مجھ سے سب سے زیادہ پیار تھا۔ زبیدہ کے لئے فکرمندی زیادہ رہی جبکہ اعجاز سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے لاڈلا رہا۔

موسیقی سے ابا جی کو رغبت نہیں تھی لیکن اسے شجرِ ممنوعہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ایک پرانا گانا ''ڈاچی والیا موڑ مہار وے'' سن کر کہتے یہ تمہارے دادا کو بہت پسند تھا۔ ابا جی کو حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی کافیاں پسند تھیں۔ عام طور پر تحت اللفظ کے ساتھ پڑھتے۔ کبھی کبھار اپنے آپ میں گنگنا بھی لیتے۔ عنایت حسین بھٹی کی آواز میں خواجہ صاحب کی کافی ''ساکوں سجناں دے ملن دی تانگ اے'' سن کر جھوم سے اٹھتے۔ انھی کی وجہ سے ہی شاید مجھے لوک گیتوں اور صوفیانہ شاعری سے دلچسپی ہوئی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ عموماً ابا جی کے چہرے پر رہتی تھی۔ جملے باز نہیں تھے مگر اچھے

جملے پر دل کھول کر داد دیتے تھے۔ ہنسی کی کسی بات پر اگر کھل کر ہنستے تو اتنا ہنستے کہ آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ ان کی اس کیفیت پر میرا جی کا شعر یاد آ گیا ہے:

نہیں گر یہ و خنداں میں فرق کچھ بھی
جو ہنستا گیا دل تو روتا گیا دل

ابا جی کی شخصیت کا جادو ایسا ہے کہ آج بھی رحیم یار خاں کے ان کے پرانے احباب سے ان کا ذکر کریں تو ان کی باتیں سناتے سناتے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ رحیم یار خاں کے پرانے محلے سے جا کر پتہ کریں تو ابا جی کا نام سنتے ہی ان کے چہروں پر محبت کی چمک آ جاتی ہے۔ میں تقریباً دس سال کے بعد پہلی دفعہ پرانا مکان دیکھنے گیا تو نہ صرف اڑوس پڑوس کے سارے لوگ جمع ہو گئے بلکہ اتنی محبت سے اپنے گھروں میں لے گئے کہ میں ان محبتوں پر حیران رہ گیا۔ گھر کی لڑکیوں، عورتوں میں سے کسی نے پردہ نہ کیا، بوڑھیوں نے سر منہ چوم لیا۔ یہ ساری محبتیں حقیقتاً ابا جی کے وسیلے سے نصیب ہوئیں۔ شوگر مل میں آج بھی ان کی بات کی جائے تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو شرارتاً ہی ان کے کردار پر انگلی اٹھا سکے۔ دراصل ابا جی صراط مستقیمی آدمی تھے۔ ایسا بننے کے لئے بڑی کٹھن ریاضت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں بھی صراط مستقیمی بننے کی کوشش کرتا ہوں مگر زگ زیگ چلتا ہوں کیونکہ مجھے احساس رہتا ہے کہ لکیریں اپنے فقیروں کو کھا جاتی ہیں۔

شروع میں ابا جی کے ساتھ تعلق میں احترام کے باعث ایک حجاب یا فاصلہ سا تھا مگر رفتہ رفتہ یہ حجاب کم ہوتا گیا۔ یکسر ختم تو نہیں ہوا مگر ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی ضرور ہو گئی کہ انسانی زندگی کے بعض حسّاس موضوعات پر ہم اطمینان سے گفتگو کر لیتے تھے۔ بعض مسائل میں انہوں نے میری رہنمائی بھی کی۔ میرے مقابلے میں ابا جی اپنے پوتوں سے زیادہ بے تکلف تھے۔ زلفی، شازی، ٹیپو تینوں ان کے ساتھ فری تھے۔ ابا جی ان کے ساتھ مختلف گیمز کھیلتے، مزے سے ہارتے اور پھر پوتوں کی بے تکلف ہوٹنگ سے لطف اندوز ہوتے۔ پہلے پہل جب میں نے شازی کو ہوٹنگ کرتے دیکھا تو اس کی بدتمیزی کو محسوس کرتے ہوئے اسے سختی سے ڈانٹا مگر اسی وقت ابا جی کی جوابی ڈانٹ مجھے پڑی کہ جیسے کرتے ہیں کرنے دو۔۔ تو میں نے دادا، پوتوں کی بے تکلفی سے

خود کو الگ کر لیا۔

علالت کی حالت میں ابا جی بار بار مجھے اور آپی کو یاد کرتے رہے یا پھر ٹیپو، مانو اور انس (چھوٹے پوتوں اور پوتی) کو یاد کرتے رہے۔ آپی نے کراچی میں کوئی خواب دیکھا اور گھبرا کر از خود ابا جی کے پاس پہنچ گئی۔ ابا جی نے آپی کو گلے سے لگا لیا۔ دیر تک روتے رہے اور پھر کومے کی حالت میں چلے گئے۔ جب میں پہنچا کومے کی حالت میں تھے۔ باقی بہن بھائی بھی جمع ہونے لگے۔ شاہدہ، بے بی، اکبر، طاہر، اعجاز سب آ گئے۔ زبیدہ امریکہ میں تھی اس کا آنا ممکن نہ تھا۔ نوید نے پہنچنے میں تھوڑی دیر کر دی۔۔ نوید آ گیا تو پانچوں بیٹے باپ کے سرہانے کھڑے ہو گئے۔ باری باری سب نے سامنے آ کر اپنا نام لیا۔ ہر آواز پر ابا جی نے آنکھیں کھولیں اور ان کی آنکھوں میں غروب ہوتے ہوئے زندگی کے سورج نے ہر بیٹے، بیٹی اور عزیز کو خدا حافظ کہا اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔

ابا جی کی وفات کے بعد ایک دوست نے تعزیتی خط میں لکھا کہ میں جب بھی خانپور میں قیام کے دنوں میں آپ کے گھر پر دستک دیتا۔ اگر آپ کے ابا جی آتے اور میں ان سے آپ کا پوچھتا تو آپ کا نام سنتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوتی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔

رحیم یار خاں کے قریب ایک گاؤں ''بستی قندھارا سنگھ'' (یا شاید بستی گندھارا سنگھ) کی ایک فیملی سے ہمارے رشتہ داروں جیسے تعلقات ہیں۔ ابا جی کی وفات کے بعد خالہ فاطمہ وہاں سے تعزیت کے لئے آئیں تو انہوں نے بتایا کہ ان کے بھائی شاہ محمد صاحب پورے خاندان سمیت بھارتی پنجاب سے سیدھے اسی گاؤں میں آئے تھے۔ عید سے چند دن پہلے ابا جی کی دکان پر گئے اور انہیں سونے کے کڑے دے کر کہنے لگے کہ اسے گروی رکھ کر ہمیں کپڑا اُدھار دے دیں تاکہ بچوں کی عید ہو جائے۔ ابا جی ان کی پسند کے مطابق کپڑا دیتے چلے گئے۔ جب ان کا مطلوبہ سارا کپڑا دے دیا تو ابا جی نے سیف سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور شاہ محمد صاحب سے کہا یہ میری طرف سے آپ کے بچوں کے لئے عیدی ہے۔ سونے کے کڑے واپس لے جائیے اور کپڑوں کی رقم جب سہولت کے ساتھ دے سکیں، دے جائیے۔۔ کسی شناسائی کے بغیر اس سلوک پر شاہ محمد

صاحب پہلے حیران ہوئے پھر آبدیدہ ہو گئے۔ نتیجتاً ان کے خاندان کے افراد سے آج بھی ایسا گہرا تعلق بنا ہوا ہے جو بعض رشتہ داروں کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ البتہ خالہ فاطمہ کے اس انکشاف کے بعد مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ابا جی کا کپڑے کا اچھا بھلا کاروبار زوال کا شکار کیوں ہوا۔

ابا جی کی وفات کے بعد ہم نے ان کی میّت کو سر سے پیروں تک گلاب کے پھولوں سے بھر دیا تھا اور پھولوں سمیت ہی دفن کیا تھا۔ وفات کے تیئسویں دن، رات کے نو بجے کے بعد اس کمرے کی کھڑکی سے گلاب کی خوشبو کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں جو ابا جی کا ذاتی کمرہ تھا۔ یہ خوشبو پہلے امی جی نے محسوس کی اور مجھے کمرے میں بلایا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے گلاب کی تیز خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیئے۔ میری ایک کزن خالدہ کے دیور شاہد حسین بھی اس وقت ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں بھی کمرے میں بلا لیا۔ انہوں نے بھی حیرانی کے ساتھ خوشبو کی موجودگی کی تصدیق کی۔ خوشبو اتنی تیز تھی کہ باہر کی گلی میں بھی ہلکی ہلکی محسوس ہو رہی تھی جبکہ کھڑکی سے تو خوشبو کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ ایک دن کے وقفے کے بعد دوپہر کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اسی کمرے میں پھر گلاب کے پھولوں کی تیز خوشبو پھیل گئی۔ اس خوشبو کو میں نے کمرے میں آ کر محسوس کیا اور پھر آوازیں دے کر سارے افراد خانہ کو جمع کر لیا۔ سب نے ہی خوشبو کو محسوس کیا۔ چند منٹ کے بعد خوشبو غائب ہوتی چلی گئی۔ دونوں دفعہ خوشبو کا جانا ایسے لگا جیسے کوئی انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل رہا ہو۔

بابا جی نے مجھے کہا کہ اگر تم اس معاملے میں دوسروں سے بات نہ کرتے تو یہ خوشبو وقتاً فوقتاً تمہاری ماں کو اور تمہیں ملتی رہتی۔ شاید خوشبو سے بڑھ کر بھی کچھ رونما ہو جاتا۔ مگر تم نے اس کا بھید افشا کر کے خود کو اس سے محروم کر لیا ہے۔ بابا جی کی باتیں بابا جی جانیں۔ لیکن یہ خوشبو کیا تھی؟۔۔ اتنی سی بات ہی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آنکھ خواب تخلیق کر سکتی ہے تو قوتِ شامہ بھی خوشبو تخلیق کر سکتی ہے۔

☆☆☆

حیدرقریشی

مائے نی میں کنوں آکھاں

(امی جی)

ماں! ترے بعد سے سورج ہے سوا نیزے پر
بس تری ممتا کا اک سایہ بچاتا ہے مجھے

''راج دلارے!
او میری اکھیوں کے تارے
میں تو واری واری جاؤں۔۔راج دلارے.....''

یہ مشہور لوری میں نے کوثر پروین کی آواز سے پہلے اپنی امی جی کی آواز میں سنی۔امی جی نے یہ لوری اپنے سارے بیٹوں میں سے صرف میرے لئے گائی۔ماں کی محبت اور دعاؤں سے بھری اس لوری نے مجھے پروان چڑھایا۔امی جی کی وفات سے کوئی سال بھر پہلے مجھے چند ماہ گوجرانوالہ میں گزارنے پڑے۔وہیں ایک روز شام کا کھانا ایک ہوٹل میں کھا رہا تھا۔اچانک یہ لوری کیسٹ پلیئر سے نشر ہونے لگی۔لوری شروع ہوتے ہی میں جیسے بچہ بن گیا اور میں نے دیکھا کہ امی جی نے مجھے۔۔چھ ماہ کے بچے کو۔۔گود میں اٹھایا ہوا ہے اور لوری سنا رہی ہیں لوری ختم ہوگئی۔۔میں بچپن عبور کر کے اپنی اصل عمر تک پہنچا تو دیکھا کہ، میں جو ابھی ماں کی گود میں کھلکھلا رہا تھا، میری آنکھیں بھیگی ہوئیں تھیں۔عجیب سا تجربہ تھا۔کئی بار سوچا امی جی کو اس تجربے سے آگاہ کروں گا مگر

پہلی محبت کے اظہار کی طرح اس تجربہ سے امی جی کو آگاہ نہ کر سکا یہاں تک کہ وہ وفات پا گئیں۔

پہلی محبت سے یاد آیا کہ میری پہلی محبت بھی میری امی جی ہیں اور آخری محبت بھی امی جی ہیں۔اس اوّل اور آخر کے بیچ میں بہت سی محبتیں آئیں مگر در حقیقت وہ سب میری پہلی اور آخری محبت کا عکس تھیں۔امی جی کا چہرہ کتابی اور گول چہرے کے بین بین تھا۔چنانچہ بیچ میں آنے والی میری ساری محبتیں بھی کتابی چہرے والی تھیں۔اپنی بیوی سے میری گہری دوستی کی وجہ شاید یہی ہے کہ امی جی کی بھتیجی ہونے کے ساتھ امی جی سے کافی مشابہت بھی رکھتی ہے۔ماہرین نفسیات اس کی جو چاہیں توجیہہ کر لیں، مجھے اعترافِ جرم سے عار نہیں۔

امی جی کی شادی کم عمری میں ہوئی۔چودہ پندرہ برس کی عمر میں، تب ابا جی کی عمر تقریباً ستائیس برس تھی۔ابا جی سرائیکی تھے، امی جی پنجابی۔عمروں اور کلچر کے واضح فرق کے باوجود میاں بیوی کی محبت کا کمال یوں ظاہر ہوا کہ ابا جی دیکھنے میں پنجابی لگتے تھے اور امی جی سرائیکی لگتی تھیں۔دونوں نے خود کو ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔من تو شدم تو من شدی والا حال تھا۔

ہمارے معاشرے میں لگائی بجھائی کرنے والے ''پھاپھے کٹنی''قسم کے کردار جا بجا نظر آتے ہیں۔ہمارے عزیزوں میں بھی بعض ایسی خواتین موجود ہیں۔امی جی کی حالت یہ تھی کہ فساد کرانا تو ایک طرف، کوئی فساد کرنا چاہتا تو اس سے بھی کوسوں دور بھاگتیں۔کوئی آکر فساد کی تیلی لگا جاتا تو خود ہی رو دھو کر چپ ہو جاتیں۔بعد میں آپی اور بے بی بھی امی کی طرح نکلیں۔زبیدہ تو صبر جمیل میں امی جی سے بھی دو قدم آگے نکل گئی (اللہ اسے اپنی حفظ و امان میں رکھے) البتہ شاہدہ نے ہمت سے کام لیا۔اس معاملہ میں امی جی کی پیروی نہیں کی۔نہ صرف خود بولنے میں مہارت حاصل کی بلکہ بے بی جیسی بے زبان کو بھی زبان عطا کر دی۔اللہ کرے زورِ زباں اور زیادہ!

امی جی محبت، وفا اور ایثار کی روشن مشرقی مثال تھیں۔شادی کے ابتدائی چند برسوں کے بعد ابا جی کا کاروبار زوال کا شکار ہوتا گیا۔انتہائی تنگ دستی تک نوبت پہنچی۔امی جی نے خدا سے تو شکوہ کر لیا مگر مجازی خدا سے کبھی شکایت نہیں کی بلکہ ہر رنگ میں ہمت بندھاتی رہیں۔خدا سے شکوہ بھی اپنی جگہ ایک اہم واقعہ ہے۔امی جی نے بے حد تنگ دستی کے باعث ایک بار انتہائی دکھ کے ساتھ کہا: خدایا! تو

کہیں ہے بھی سہی یا نہیں؟۔۔اسی رات امی جی نے خواب دیکھا: نہایت تیز روشنی ہے۔ جب اس کا منبع ڈھونڈ نا چاہتی ہیں تو بڑی پُر ہیبت آواز آتی ہے۔۔''حمیدہ! ادھر دیکھو میں تمہارا خدا ہوں''۔ خوف اور رعبِ خداوندی سے امی جی کی آنکھ کھل گئی۔ سخت سردی کے موسم میں پسینے سے شرابور ہو گئیں۔ اُس دن سے لے کر موت کے دن تک پھر امی جی کو خدا کے وجود کے بارے میں کبھی شک نہیں ہوا۔

ابا جی کی ''وِل پاور'' کے کئی کرشمے دیکھنے کے باوجود امی جی نے انہیں بزرگ تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ اس معاملہ میں ہمیشہ ہی ابا جی کو چھیڑتی رہیں اور ہار کر بھی ہار نہیں مانتی رہیں۔۔ایک دفعہ کسی اَٹکے ہوئے کام کی وجہ سے امی جی فکرمند تھیں۔ میں نے ازراہ مذاق کہا چلیں اگر آپ کا یہ کام ہو جائے تو پھر مجھے بزرگ مانیں گی؟۔۔فوراً بولیں: میں نے تمہارے باپ کو ساری زندگی بزرگ نہیں مانا تمہیں کیسے مان لوں گی۔ چل بھاگ جا۔ انگریز کی ولایت کا ویزا لگوا نہیں سکتا اور چلا ہے خدائی ولایت کی طرف۔

میرے چھوٹے بیٹے ٹیپو کی عمر پانچ سال تھی۔ جب اس نے مجھ سے سوال کیا کہ اللہ میاں کہاں ہے؟ میں نے اسے سمجھایا کہ بیٹا! ہم اللہ میاں کو دیکھ نہیں سکتے۔ اس نے فوراً اعتراض کیا کیوں نہیں دیکھ سکتے؟۔۔ میں نے سوچا چھوٹا بچہ ہے اسے اس کے ذہن کے مطابق سمجھاتا ہوں۔ چنانچہ میں اسے سورج کے سامنے لے گیا اور کہا سورج کی طرف دیکھو۔۔۔

اس نے دیکھنے کی کوشش کی اور پھر بے بسی سے کہا میں نہیں دیکھ سکتا۔ تب میں نے اسے سمجھایا کہ اللہ میاں کا نور اس سے بھی زیادہ تیز ہے اس لئے ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے یہ قصہ امی جی کو بتایا وہ ہنس کر چپ ہو گئیں۔ اگلے دن ٹیپو نے اپنے چھوٹے چچا اعجاز کی گہری سیاہ عینک پہنی، سورج کی طرف دیکھنے کی پریکٹس کی اور پھر میرے پاس آیا۔ ''میں اب سورج کی طرف دیکھ سکتا ہوں''۔ یہ کہہ کر اس نے عینک پہنی اور سورج کو دیکھنے کا مظاہرہ دکھایا اور پھر مطالبہ کیا کہ اب اللہ میاں بھی دکھایئے۔ میں ٹیپو کے مطالبے پر چکرا گیا مگر امی جی نے ٹیپو کو پیار سے گود میں اٹھالیا اور کہنے لگیں بیٹے اگر تم اس مقام تک آ گئے ہو تو ایک نہ ایک دن اللہ میاں کو بھی دیکھ لوگے۔ پھر مجھے کہنے لگیں پہلے انوکھے لاڈلے چاند مانگتے تھے مگر یہ تو اللہ میاں سے کم پر راضی ہی نہیں ہوتا۔

امی جی میں جمالیاتی ذوق کی فراوانی تھی۔ ستم ہائے زمانہ نے اسے کچلا تو دیا مگر ختم نہ کر سکا۔ امی جی نے ایک زمانے میں پنجابی میں ایک طویل دعائیہ نظم کہی تھی اس کی ردیف ''مولا'' اور قافیہ دعا، صدا وغیرہ تھا۔ اتنا ہی مجھے یاد ہے۔ افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق بھی انہیں ایک عرصہ تک رہا۔ میری ادبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتیں۔ کسی اہم پیشرفت کی خبر سن کر خوش ہوتیں۔ میرے متعدد افسانوں میں امی جی کا کردار اپنی توانائیوں کے ساتھ براہ راست موجود ہے۔ ''دھند کا سفر''۔ ''آپ بیتی'' اور ''روشنی کی بشارت'' یہ تینوں افسانے ان کی زندگی میں ہی ''نگار پاکستان'' ''اوراق'' اور ''جدید ادب'' میں چھپ گئے تھے۔ ''روشنی کی بشارت'' پڑھ کر کہنے لگیں کبھی میں تمہیں کہانیاں سنایا کرتی تھی اور اب تم میری کہانیاں بنانے لگ گئے ہو۔ چہرے پر مسّرت تھی۔ امی جی کے تبصرے نے بچپن کے کتنے ہی حسین مناظر کی فلم آن کر دی:

نصف شب
جیسے خوشبو بھری گود
رِستے ہوئے زخم پر جیسے پھاہا ر بدن کو تھپکتی ہوئی چاندنی
سر کے ژولیدہ بالوں میں پھرتی ہوئی ریشمی انگلیاں
ماں کے ہونٹوں کی لَو پر
سلگتی ہوئی اک کہانی کے پر
سات رنگوں کے پر
قاف کی اُس پری کے
جسے ڈھونڈنے کے لئے شاہزادہ
پہاڑوں کی جانب روانہ ہوا!

وفات کے بعد امی جی میری شاعری میں بھی آنے لگیں:

یہ ساری روشنی حیدرؔ ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ وفات پا گئیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام حسبِ عادت دربار خداوندی میں بے تکلفی سے جانے لگے تو آواز آئی: موسیٰ! احترام کو ملحوظ رکھو۔ وہ فوت ہو گئی جو ہر وقت تمہارے لئے دعائیں کرتی رہتی تھی اور جس کی دعاؤں کے طفیل تمہاری بے تکلفی برداشت کر لی جاتی تھی۔ وہ دعائیں کرنے والی نہیں رہی تو اب پورے احترام کے ساتھ آؤ۔ خدا جانے یہ روایت کس حد تک درست ہے تاہم اس سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر، عالی مقام اور کلیم اللہ کے لقب کے حامل پیغمبر کے گرد بھی ماں کی دعاؤں کا بہت بڑا حفاظتی حصار تھا۔۔ میں نہایت کمزور، عاجز اور گنہگار انسان ہوں۔ مجھے بھی امی جی کی زندگی تک ان کی دعاؤں کا بڑا سہارا رہا۔ زندگی میں جب بھی کچھ ٹھان لیا، کر گزرا۔ اس میں کامیاب نہیں ہوا تو نقصان سے بھی بچتا رہا۔ امی جی کی وفات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب قدرت کی طرف سے پہلے جیسی رعائت نہیں مل رہی۔ اس حقیقت کو محسوس کر کے میں نے کہا تھا:

حیدر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابا بھی چل بسے تری ماں بھی نہیں رہی

بچپن میں۔۔ امی جی نے ایک دفعہ میری شرارتوں سے تنگ آ کر مجھے ابا جی کے ساتھ دوکان پر بھجوا دیا۔ ابا جی نے وہاں سزا کے طور پر میری ٹنڈ کرا دی۔ میں خوشی سے چھلانگیں مارتا ہوا گھر آیا اور امی جی سے کہا: امی جی، امی جی۔۔ میں بھی ابو کی طرح ہو گیا ہوں اب میں بھی ابو بن جاؤں گا اور پھر اپنے بچوں کو ڈانٹا کروں گا۔

رحیم یار خاں میں ہماری ایک ہمسائی بوا زیبو ہوتی تھیں۔ ان کے بیٹے ظفر سے ہم عمری کے باعث دوستی تھی۔ اس سے میں نے سرائیکی زبان میں ایک سلیس قسم کی گالی سنی جو اس نے اپنے گدھے کو دی تھی۔ مجھے وہ گالی بہت اچھی لگی۔ ایک اور موقعہ پر میں نے بھی ان کے گدھے کی شان میں وہی گالی 'ارشاد' کر دی۔ امی جی کو پتہ چلا تو میری خوب مرمت ہوئی۔ وہ دن اور آج کا دن، پھر وہ گالی میرے منہ پر چڑھ ہی نہیں سکی۔

ہم خانپور میں تھے۔ میں غالباً ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ امی جی کو کسی کام کے

سلسلے میں کراچی میں مقیم خالہ سعیدہ اور ماموں کوثر کے ہاں جانا پڑ گیا۔ امی جی کو گئے ابھی تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ میں نے دوپہر کے وقت با آواز بلند رونا شروع کر دیا۔ ابو جی پریشان۔۔ کہ معاملہ کیا ہے۔ مجھ سے بار بار پوچھیں کیا ہوا ہے؟ مگر شدّتِ غم سے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکلتے تھے۔ بڑی مشکل سے ہچکیوں کے دوران ایک دو دفعہ امی۔ امی کہہ سکا۔ ابا جی بھی شاید اداس بیٹھے تھے۔ میرے رونے کا بہانہ ان کے ہاتھ لگ گیا، جھٹ امی جی کو تار بھیج دیا اور امی جی واپس آ گئیں۔

امی جی فوت ہوئیں تو میں ساکت ہو گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں مگر ساون بھادوں کی وہ برسات نہ ہوئی جو دو سال پہلے ابا جی کی وفات پر ہوئی تھی۔ اس بارے میں مجھے ابھی تک ایک مجرمانہ سا احساس ہے۔ کبھی سوچتا ہوں ابا جی کو امی جی کی ہم سے زیادہ ضرورت تھی۔ شاید اسی لئے موسلا دھار بارش نہیں ہوئی۔ کبھی خیال آتا ہے کہ میں تو امی جی کے حصے کا بھی ابا جی کی وفات پر ہی رو چکا ہوں کیونکہ امی جی تو ابا جی کی وفات کے ساتھ ہی فوت ہو گئیں تھیں۔ وہ تو صرف دعاؤں کا ایک مجسمہ تھا جو ہمارے ساتھ تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔۔ لیکن کبھی کبھی جب ماں کے سمندر وجود اور اپنے جزیرے پن کا احساس جاگتا ہے تو مجرمانہ احساس جیسے زائل ہونے لگتا ہے:

کبھی جب رات ڈھلتی ہے
فلک سے قطرہ قطرہ اوس کی برکھا اترتی ہے
کبھی جب پیاس کی شدت میں زخمی ہونٹ
بہتی تیز ندی کے بجل سینے پہ جھکتے ہیں
کبھی جب آنکھ رِستی ہے۔
تو یوں لگتا ہے جیسے ہم کبھی بچھڑے نہیں اس سے
کہ جیسے ہم جزیرے ہیں
تھپکتے، لوریاں دیتے سمندر کے
بلکتے زرد رُو بیمار بچوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں
ہماری ہجرتوں کی داستاں جھوٹا فسانہ ہے!

امی جی بیک وقت باحوصلہ بھی تھیں اور کمزور دل بھی ۔۔ باحوصلہ اس طرح کہ نہایت کٹھن اور دکھ بھری زندگی کو ہمت اور صبر کے ساتھ بسر کیا۔ کمزور دل اس طرح کہ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سے بھی سہم جاتیں۔ رحیم یار خاں قیام کے زمانے میں ایک بار ابا جی دوکان سے جلد واپس نہ آ سکے۔ امی جی نے سر شام ایک ہمسائی نانی اللہ وسائی کو گھر پر بلا لیا۔ نانی اللہ وسائی امی جی سے بھی زیادہ کمزور دل تھیں۔ اچانک بادل زور سے گرجے اور بجلی کڑکتی چلی گئی۔ نانی اللہ وسائی اور امی جی نے بیک وقت زور سے چیخ ماری اور ایک دوسری سے چمٹ گئیں۔ ابا جی جب بھیگتے بھاگتے گھر پہنچے، امی جی نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ پھر ابا جی سر شام ہی گھر آ جایا کرتے تھے، لیٹ نہ ہوتے تھے۔

امی جی کو جب شوگر کی شکایت ہوگئی تو میں نے احتیاطی تدابیر کی طرف توجہ دلائی مگر ان کا ایک ہی جواب تھا، اگر میٹھی چیزیں کھانے سے موت آتی ہے تو آنے دو۔ میں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو امی جی نے دودھ بغیر چینی کے پینا شروع کر دیا مگر مٹھائی کو پرہیزی لسٹ میں شامل کرنے کے لئے وہ آخر دم تک تیار نہ ہوئیں۔ بالآخر میٹھی چیزیں کھا کر ہی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔۔ ابا جی کی وفات کے بعد دراصل امی جی میں زندہ رہنے کی خواہش ختم ہوگئی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ مٹھائی کو جان بوجھ کر بطور زہر کھا رہی تھیں۔ اسی لئے ابا جی کی وفات کے بعد دو سال کے عرصے کے اندر ہی امی جی فوت ہوگئیں۔

امی جی مجھے ڈاکٹر بنانے کی خواہش مند تھیں۔ میرا ذہن شروع سے ہی ''نان میڈیکل'' بلکہ ''نان سائینس'' تھا۔ ایک مرحلہ پر سوچا کہ اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے لوں۔ نام کے ساتھ ڈاکٹر تو لکھا جا سکے گا۔ پھر دیکھا کہ ایسے ایسے لوگ بھی ڈاکٹریٹ کر گئے ہیں کہ پی ایچ ڈی کہلانا باعث افتخار نہیں، باعث ندامت محسوس ہونے لگا ہے۔ اس سے بہتر ہے آدمی ''گھر بیٹھے ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنئے'' کورس کر لے۔ اس سے خلقِ خدا کو فائدہ بھی نہیں ہوگا تو نقصان بھی نہیں ہوگا۔ آخر یہ طے ہوا کہ جہاں میں امی جی کی اور بہت سی خواہشیں اور خوشیاں پوری نہیں کر سکا وہیں اس خواہش کی عدم تکمیل پر بھی ہلکے سے دکھ اور افسوس کے ساتھ ماندہ زندگی گزار لوں گا۔

امی جی کی گائی ہوئی لوری کا ایک ایک لفظ الٹ ہو گیا ہے۔ ان کی اکھیوں کے تارے کی اپنی قسمت کا ستارہ ہی کہیں گم ہو گیا ہے۔ امی کے باغ کا البیلا پھول وقت کے صحرا میں خود دھول ہو رہا ہے۔ جس کے مکھڑے کے آگے چاندنی میلی لگتی تھی اس کا رنگ روپ بگڑ چکا ہے۔ حالات کا تپتا، دہکتا سورج سوا نیزے کے فاصلے پر آن کھڑا ہے۔ اب تو صرف اُس جنت کی امید ہے جو ماں کے قدموں تلے ہوتی ہے:

ماں! ترے قدموں تلے جب راکھ اُڑتی ہے
تو سینے میں خلا جیسی کوئی شے گونجتی ہے
وہ گیت اب کھو گیا ہے
تو بھی اب چپ ہوگئی ہے اور خلا ویسے کا ویسا ہے
مرے سینے میں تیری مامتا کا نور اُترتا ہے
مگر کچھ بولتا بھی تو نہیں
اقرار کی ساعت ہمیشہ سے ادھوری ہے
نہ جانے کونسا کوہِ گراں ہے تیرے ہاتھوں پر....
یہ تو ہے یا کوئی خیمہ طنابوں کی شکست آثار مٹی سے نکل کر
زرد موسم کی ہوا میں لڑکھڑاتا ہے۔
یہ میں ہوں یا کوئی سایہ تری ممتا کی ٹھنڈی روشنی سے ٹوٹ کر
پاتال اندر ڈوبتا جاتا ہے
ہم دونوں
محبت کی گواہی کی طلب میں
اپنے اپنے دل کی جانب رُخ کئے اپنے خدا سے پوچھتے ہیں
حشر کب تک آئے گا۔۔!

☆☆☆

’’میری محبتیں‘‘ کے دوسرے خاکوں میں

ابا جی رامی جی کا ذکر

ابا جی بتاتے تھے کہ وہ بمشکل چھ سال کے تھے جب ہماری دادی فوت ہوگئیں۔ابا جی نے ایک لمبی سی قمیص پہنی ہوئی تھی۔قمیص کی طوالت کے باعث نیچے کسی شلوار یا جانگیہ کی اُس زمانے میں ضرورت نہیں ہوتی تھی۔قمیص کی جیب میں ریوڑیاں اور مکھانے بھر دیئے گئے تھے۔ ابا جی بتاتے تھے میں نے اپنی اماں کی تدفین کا سارا منظر دیکھا تھا۔زیادہ تر ریوڑیاں مکھانے کھا کر دیکھتا رہا۔کبھی کبھار رونے بھی لگ جاتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔دادی جان رحیم یار خاں میں فوت ہوئی تھیں۔جب تک ہم وہاں رہے ابا جی ہر محرّم کی دس تاریخ کو ہمیں ساتھ لے کر قبرستان جاتے۔ دادی جان کی قبر پر پھول پتے اور خاص طور پر کھجور کے پتوں کی چھڑیاں چڑھاتے۔خیرات کرتے، دعا کرتے۔خان پور چلے گئے تو پھر کبھی کبھار رحیم یار خاں دعا کے لئے چلے جاتے۔ایک دفعہ رحیم یار خاں سے آئے تو اُداس اُداس تھے۔خود ہی بتانے لگے میں ماں کی قبر بھول گیا ہوں۔ بہت تلاش کی، نہیں ملی۔قبرستان بہت پھیل گیا ہے۔قبرستان کے مین گیٹ پر ہی کھڑے ہوکر دعا کر آیا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

امی جی نے دادا جی کو نہیں دیکھا تھا۔امی جی بتاتی تھیں کہ ایک دفعہ ابا جی کسی بات پر امی جی سے ناراض ہوئے۔پھر حسبِ عادت صلح بھی کر لی مگر ابا جی کی ناراضگی کے باعث امی جی کے دل پر گہرا اثر تھا۔اسی حالت میں سو گئیں۔خواب میں دیکھا کہ ہمارے دادا جی آئے ہیں۔انہوں

نے امی جی کے سر پر دست شفقت رکھا، پیار کیا۔امی جی کو کچھ نقدی دی اور کہا: میں غلام سرور کو ڈانٹوں گا آئندہ تمہیں رنج نہیں دے گا۔امی جی کی آنکھ کھلی تو بے حد حیران ہوئیں۔ابا جی کو سارا خواب سنا کر دادا جی کا حلیہ بھی بتایا۔ابا جی بھی حیران ہوئے کیونکہ امی جی کا بیان کردہ حلیہ سو فیصد درست تھا۔اس خواب کے تھوڑا عرصہ بعد دادا جی کی دی ہوئی نقدی کے نتیجہ میں ہماری بڑی بہن آپی پیدا ہوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ابا جی بتاتے تھے: دادا جی آخری ایام میں معمولی سا علیل ہوئے پھر ٹھیک ہو گئے۔ان دنوں میں ابا جی انہیں رات کو دیر تک دباتے رہتے اور جب تک دادا جی خود نہ کہتے کہ بیٹا بس کرو، تب تک دباتے رہتے۔۔اُس رات اتفاق سے دادا جی گہری نیند سو گئے اور ابا جی اپنی دُھن میں ساری رات دادا جی کو دباتے رہے یہاں تک کہ فجر کی اذان ہوگئی۔تب دادا جی چونک کر بیدار ہوئے اور کہنے لگے غلام سرور! تم ساری رات دباتے رہے ہو۔۔پھر دعائیں دیتے ہوئے کہنے لگے اب بس کرو۔ابا جی وہاں سے اٹھ کر محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔واپس آئے تو بابا جی نے کہا: غلام سرور! ابا فوت ہو گئے ہیں۔۔ڈاچی والے عرب اور چولستان کے صحراؤں سے بھی آگے کائنات کے وسیع تر صحرا کی طرف چلے گئے اور کتنے اطمینان و سکون کے ساتھ چلے گئے۔

(دادا جی کے خاکہ ’’ڈاچی والیا موڑ مہار وے‘‘ سے اقتباس)

ابا جی کے بھائی۔۔جنہیں ہم سب بابا جی کہتے تھے، ابا جی سے عمر میں بڑے تھے۔ ابا جی نے زندگی ایک مقالہ نگار کی طرح بسر کی تو بابا جی نے انشائیہ نگار کی طرح زندگی گزاری۔وہ صراط مستقیم کی صداقت کے قائل تھے مگر ٹیڑھی میڑھی اور اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلنا اور ارد گرد بکھرے ہوئے رنگوں اور خوشبوؤں سے لطف اٹھانا انہیں پسند تھا۔بابا جی نے بھرپور جوانی بسر کی۔ ابا جی اور بابا جی دونوں ایک دوسرے کے نیگیٹو تھے۔ابا جی کے مزاج کے برعکس بابا جی خواتین کی محفلوں میں بیٹھ کر ہمیشہ خوش ہوتے۔

بابا جی ہمارے ابا جی سے عمر میں پندرہ سال بڑے تھے۔ابا جی جب پرائمری سکول میں

بڑھنے جاتے تو واپسی پر ایک درخت کے نیچے لیٹ کر سو جاتے۔ باباجی باقاعدگی سے اباجی کو گود میں اٹھا کر گھر لاتے۔ بڑے بھائی ہونے کے ناطے باباجی احترام کے لائق تھے مگر ہم نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ باباجی ہمارے اباجی کا ایسے احترام کرتے جیسے سعادت مند چھوٹے بھائی اپنے بڑے بھائی کا احترام کرتے ہیں۔ اباجی جب پینتالیس سال کے تھے باباجی ساٹھ سال کے تھے۔ اباجی پچاس سال کے ہوئے باباجی ساٹھ سال کے رہے۔ اباجی چونسٹھ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ باباجی پھر بھی ساٹھ سال سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھے۔ ہم نے منت سماجت کی تو بمشکل پینسٹھ سال کے ہوئے اور پھر جب بیاسی سال کی عمر میں فوت ہوئے تب بھی پینسٹھ سال کے تھے۔ دراصل باباجی کو گزرتی ہوئی عمر کو روکنے کا ہنر آتا تھا۔ مرتے دم تک باباجی نے ورزش کو ہی اپنی عبادت بنائے رکھا اور اس ورزش کی برکت سے بیاسی سال کی عمر تک بالکل ہشاش بشاش رہے۔

(باباجی کے خاکہ ''مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ'' سے اقتباس)

ماموں ناصر کے ساتھ میری محبت دراصل ''بچپن کی محبت'' ہے میں نے ابتدائی عمر میں ہی دیکھا کہ ماموں ناصر کو اپنی بہنوں میں میری امی جی سے خاص محبت تھی۔ اتنی خاص کہ دوسری بہنوں کے لئے بھی بعض اوقات غصے کا موجب بن جاتی۔ بے جی (نانی جان) بھی کبھی کبھی جھلا جاتیں۔ امی جی کے تعلق سے یہ محبت اباجی تک بھی پہنچی ماموں ناصر اباجی کا بے حد احترام کرتے۔ رحیم یار خان میں تنگی کے دنوں میں جب بھی ماموں ناصر سے قرض مانگا انہوں نے فوراً فراہم کیا، چاہے خود بھی کہیں سے قرض ہی کیوں نہ لیا ہو لیکن اباجی کے کام میں تاخیر نہیں ہونے دی۔۔ ایک موقعہ پر بہت سارے عزیز واقارب جمع تھے۔ اباجی اپنے جوتوں کی مرمت اور پالش کرانے کے لئے کسی بچے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ جب تک کوئی بچہ ملتا ماموں ناصر بتائے بنا خود اباجی کے جوتے لے کر چلے گئے اور مرمت کرا کے، پالش کرا کے لے آئے۔۔ امی جی اور اباجی کے ساتھ ماموں ناصر کے ایسے محبتی رویّے کی متعدد مثالیں ہیں۔ اسی وجہ سے بچپن میں ہی مجھے ماموں

ناصر سے محبت ہو گئی۔ مبارکہ کے ساتھ میری شادی ہونے میں میری پسند کے علاوہ امی جی اور ماموں ناصر کی گہری محبت کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

(ماموں ناصر کے خاکہ ''رانجھے کے ماموں'' سے اقتباس)

عام طور پر ماہرین کا خیال ہے کہ کسی بچے کے بعد جو بچہ پیدا ہوتا ہے ان دونوں میں خوامخواہ کی مخاصمت پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل پہلا بچہ یہ سمجھتا ہے کہ بعد میں آنے والے نے اس سے اس کی ماں کی محبت چھین لی ہے۔۔ اسی طرح ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ پہلوٹھی کی اولاد اور باپ میں بھی ایک اندرونی مخاصمت ہوتی ہے کیونکہ عورت کی توجہ شوہر سے ہٹ کر پہلے بچے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں باتیں عمومی طور پر بڑی درست پائی جاتی ہیں لیکن آپی کی حد تک یہ دونوں باتیں غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ پہلی اولاد ہونے کے باوجود اباجی کو ہمیشہ آپی سے بے حد محبت رہی۔ میں آپی کے بعد پیدا ہوا مگر ہم دونوں میں جو محبت ہے وہ شاید کسی اور بہن بھائی کے حصے میں نہیں آ سکی۔ ماہرین کی دونوں باتیں غلط ثابت ہوئی ہیں تو یہ سراسر آپی کی اپنی خوبی ہے۔

امی جی بتایا کرتی تھیں کہ پیدائش کے وقت آپی انتہائی کمزور اور لاغر تھی۔ ثبوت کے طور پر امی جی نے آپی کو پہنائی جانے والی پہلی قمیص سنبھال رکھی تھی جو شاید اب آپی کے پاس ہی محفوظ ہے لیکن اس وقت ہم سارے بہن بھائیوں میں جسامت کے لحاظ سے آپی اول نمبر پر ہے۔

(آپی کے خاکہ ''محبت کی نمناک خوشبو'' سے اقتباس)

امی جی اور مبارکہ میں گہری انڈرسٹینڈنگ تھی۔ ساس بہو میں کبھی کبھی بدمزگی بھی ہوتی مگر ایسی نہیں جس میں اباجی کو یا مجھے مداخلت کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ جلد ہی ساس، بہو کی جگہ پھوپھی، بھتیجی آگے آ جاتیں اور خود ہی سارا معاملہ سنبھال لیتیں۔ آخر دم تک امی جی اور مبارکہ ایک ساتھ رہیں، صرف ایک سال کا عرصہ دونوں کو الگ رہنا پڑا کیونکہ خانپور چھوڑ کر اباجی اور امی جی نے بالائی پنجاب میں سکونت اختیار کر لی تھی اور ملازمت کے باعث ہم شوگر ملز کی کالونی میں

شفٹ ہوگئے تھے۔اس ایک سال کے عرصہ میں بھی مبارکہ، امی جی سے ملنے کے لئے دو دفعہ گئی۔۔اسی دوران ابا جی وفات پا گئے۔شدید صدمے کا اثر زائل ہونے لگا تو سارے عزیز اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹنے لگے۔اکبر اور طاہر بھی امی جی سے اجازت لئے بغیر اپنی بیگمات کے ساتھ رخصت ہوگئے۔جاتے جاتے امی سے اتنا کہہ گئے کہ عدت پوری کر کے ہمارے ہاں آ جایئے گا۔ مبارکہ جانتی تھی کہ امی جی اس طرح تو کسی بیٹے کے پاس بھی نہیں جائیں گی۔اس نے مجھے الگ کر کے سارے صورتحال سے آگاہ کر کے کہا میں ایسی حالت میں پھوپھی کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ جا کر بچوں کے سکول چھوڑنے کے سرٹیفکیٹ بھجوا دیں۔میں اب پھوپھی کے پاس ہی رہوں گی۔چنانچہ پھر مبارکہ اور بچے امی جی کے پاس ہی رک گئے۔

(مبارکہ کے خاکہ ''پسلی کی ٹیڑھ'' سے اقتباس)

ٹیپو کو اللہ میاں کو دیکھنے کا بہت شوق رہا ہے۔اس کے اس شوق کا ایک واقعہ امی جی والے خاکے میں آ چکا ہے جس سے اس کے تجسّس اور تگ ودو کا اندازہ ہوتا ہے۔ٹیپو کے ایک اور ایکشن نے میری ایک پرانی الجھن دور کر دی تھی۔ابا جی کو یوں تو میرے پانچوں بچوں سے بے حد محبت تھی تاہم ٹیپو اور مانو چونکہ سب سے چھوٹے تھے اس لئے ان دونوں سے کچھ زیادہ ہی پیار کرتے تھے۔نتیجتاً وہ محبت ان بچوں میں بھی ظاہر ہوئی۔ابا جی کی وفات پر ٹیپو پریشان تھا کہ دادا ابو جاگتے کیوں نہیں؟۔اسے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اب نہیں جاگیں گے کیونکہ اللہ میاں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے۔ٹیپو نے غصے سے کہا میں اللہ میاں کو ماردوں گا۔ تب چار سال کے اس بچے کو مزید سمجھانا پڑا کہ اللہ میاں کے بارے میں ایسی بات نہیں کہتے کیونکہ وہ بہت بڑا ہے۔ٹیپو کے نزدیک تو سارے خاندان میں دادا ابو ہی سب سے بڑے تھے چنانچہ اس نے پوچھا کیا اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑے ہیں؟ اس پر اسے یقین دلانا پڑا کہ اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑے ہیں اور ہر کسی سے بڑے ہیں۔کوئی زیادہ سے زیادہ کتنا بڑا ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے اللہ میاں کتنا بڑا ہے؟ یہ جاننے کے لئے ٹیپو نے اپنے دونوں بازو کھولے اور انہیں جس حد تک

پیچھے لے جا سکتا تھا، لے جا کر پوچھا: کیا اللہ میاں اتنے بڑے ہیں؟۔۔بس اسی لمحے میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے خدا کے بارے میں عقائد اور تصورات مجھ پر آئینہ ہوگئے۔مجھے محسوس ہوا کہ سارے مذہبی لوگ ننھے منے معصوم بچوں کی طرح اپنی اپنی بانہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔جس کی بانہیں جہاں تک جا سکی ہیں اس نے اسی حد تک خدا کو بڑا سمجھ رکھا ہے کیونکہ اس سے زیادہ بڑائی اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی۔

(''زندگی کا تسلسل'' سے اقتباس)

وزیر آغا نے ایک دو بار میرے گھر کو بھی اپنی آمد سے رونق بخشی۔ایک دفعہ ابا جی کی زندگی میں آئے۔ابا جی اور وزیر آغا کی مختصر سی ملاقات ہوئی۔ابا جی کسی اور لائن کے آدمی تھے لیکن وزیر آغا کے جانے کے بعد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے بھئی تمہارے وزیر آغا کی آنکھوں میں بڑی انوکھی چمک ہے اور اس کے چہرے پر کسی روشنی کا ہالہ سا محسوس ہوتا ہے ابا جی کی ملاقات و۔ع۔خ سے ہوتی تو شاید کچھ ایسی صورت بنتی:

اس نے کاغذ پہ لکھا روگ تمہارا یہ ہے
میں نے کاغذ پہ لکھا روگ تمہارا بھی تو میرے ہی سجل روگ کا آئینہ ہے
اور پھر آئینے اک دوسرے کو دیکھ کے حیران ہوئے
اپنے روگوں کے نگہبان ہوئے!

(وزیر آغا کے خاکہ ''عہد ساز شخصیت'' سے اقتباس)



حیدر قریشی

میں انتظار کرتا ہوں!

خزاں رسیدہ سہی پھر بھی میں اگر چاہوں
جہاں نگاہ کروں اک نئی بہار اُگے

میں سوتیلے جذبوں کے عذابوں سے گزرتا ہوں کہ مجھے اپنا سفر مکمل کرنا ہے۔

میں کسی صحرا میں پیاس کی شدّت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔

اور ماما تا کی ماری میری ماں پانی کی تلاش میں ہلکان ہوتی پھر رہی ہے۔

میں کسی اندھے کنوئیں میں گرا پڑا ہوں۔

اور میرے بھائی ان سوداگروں سے بھی میری قیمت وصول کر رہے ہیں جو کچھ دیر بعد مجھے اس کنوئیں سے نکالیں گے اور غلام بنا کر لے جائیں گے۔

میں کسی جنگل میں بَن باس کے دن گزار رہا ہوں۔

مری بیوی مجھے ہرن کا شکار لانے کے لیے کہتی ہے۔ میں ہچکچاتا ہوں مجھے معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا مگر پھر میں بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔

☆☆

میں کہ سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔

میری تاریخ کے سفر کا ایک حصہ مکمل ہو گیا ہے ''لچھمن ریکھا'' عبور ہوتے ہی تاریخ کے

سفر کا دوسرا حصہ شروع ہو گیا ہے۔ میں کسی غیبی امداد کا منتظر ہوں۔

میں اندھے کنوئیں سے نکال لیا گیا ہوں۔

مگر میں ابھی تک اندھے کنوئیں میں ہوں کہ زلیخا میرے تعاقب میں ہے اور میں گناہ کے اندھے کنوئیں سے نکلنے کے لئے مسلسل دوڑ رہا ہوں۔

پیاس کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

اور میری ماں جو دوڑتے دوڑتے تھک کر چُور ہو گئی ہے۔ ابھی تک پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے اس کے اپنے ہونٹوں پر پیاس کی پپڑیاں جم گئی ہیں۔ مگر دور دور تک کسی قافلے کے آثار نظر نہیں آتے۔

میری بے گناہی۔۔۔ میری نیکیاں دنیا نہیں دیکھتی اور میں تہمتوں کی زد میں ہوں۔

میں اذیت میں ہوں کہ میری ماں ابھی تک میری خاطر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

وہ جو بادشاہ زادی ہے۔ میرے سوتیلے بھائی اسے لونڈی اور مجھے لونڈی کا بیٹا کہتے ہیں۔

میں دکھ میں ہوں کہ حاکم کی بدکار بیوی مجھے میری نیکی کی کڑی سزا دلواتی ہے۔

میں قید میں ہوں کہ بدکاری کی تہمت مجھ پر عائد کر دی گئی ہے۔

اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے کہ میری پاک دامن بیوی پر بدکاری کا الزام عائد کیا گیا ہے۔

یہ سارے جھوٹے الزام اور تہمتیں وہی لگا رہے ہیں جو خود بدکار ہیں۔ جو میرے سوتیلے عزیز ہیں۔ وہ میرے گرد سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن جمع کر رہے ہیں تا کہ اس میں نفرتوں کی آگ لگا کر مجھے بھسم کر ڈالیں۔

میں اس آگ سے بچنے کے لئے دعا کرتا ہوں کہ میں بے حد کمزور ہوں۔

☆☆

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لیے ہزاروں برس سے انتظار کر رہی تھیں۔

اور میں وہی ہوں..... چاند، سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔

اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔

مگر میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔

میں سوچتا ہوں۔

میں کن امتحانوں آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گزر رہا ہوں؟

میری پاکدامن بیوی کی صفائی کون دے کہ میرا واسطہ بدکاروں سے ہے جو اپنی برائیاں چھپانے کے لئے دوسروں پر تہمتیں عائد کرتے ہیں۔

اور میری اپنی صفائی کون دے کہ میں اب بھی گناہ پر آمادہ ہو جاؤں تو وہی عورت میری بے گناہی کی گواہی دے کر مجھے چھڑا لے جائے گی جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔

اور میری ماں.... بادشاہ زادی.... جو میری حالت نہیں دیکھ سکتی اور اس کی بے قراری دیکھ کر میرا اپنا دِل خون ہوتا ہے اور میں پہلے سے زیادہ زور کے ساتھ ایڑیاں رگڑنے لگتا ہوں، وہ کب تک پانی کی تلاش میں پہاڑیوں کا سفر کرتی رہے گی۔

☆☆

سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن میرے چاروں طرف جمع کیا جا چکا ہے اس ایندھن کے انبار پہاڑوں کی بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔

وہ صحرا جس میں، میں ابھی تک پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور میری ماں پانی کی تلاش میں چکراتی پھر رہی ہے،

اور وہ اندھا کنواں جس میں مجھے ڈالا گیا تھا اور وہ جیل جس میں، میں اس وقت قید ہوں، اور وہ جنگل جس میں مجھے اپنے بن باس کے سارے دن گزارنے ہیں، سب اس ایندھن کے حصار میں آ گئے ہیں۔ ایندھن کے اس حصار کی دوسری طرف میرے سوتیلے عزیز جشن منا رہے ہیں، میری تضحیک کر رہے ہیں، قہقہے برسا رہے ہیں۔ اور وہ لمحہ قریب آتا جا رہا ہے جب وہ اس ایندھن میں نفرت کی آگ لگائیں گے۔ آگ چاروں طرف پھیل جائے گی۔ تب یہ صحرا، یہ اندھا کنواں، یہ جنگل اور میں... میری بے گناہی اور سچائی کے سارے نشان اس آگ میں جل کر فنا ہو جائیں گے۔ مٹ جائیں گے۔ اور میرے سوتیلے عزیزوں کے سوتیلے جذبوں کے ظلم کا کوئی

ثبوت باقی نہیں رہے گا۔ تب میرے سوتیلے عزیز اپنی مرضی کے مطابق میری تاریخ لکھیں گے، تب وہ اطمینان سے لکھیں گے کہ:

میں بدکار تھا اور میری بیوی بھی بدکار تھی اور میری ماں لونڈی تھی... مگر میرا باپ؟

☆☆

میں پھر سوچنے لگتا ہوں

میں جو صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔ ابراہیم کا بیٹا ہوں۔

اور میں جو جرم بے گناہی میں قید بھگت رہا ہوں، ابراہیم کا پوتا ہوں۔

اور میں جو جنگل میں بن باس کے دن کاٹ رہا ہوں۔ میں بھی ابراہیم کی آل سے ہوں

کہ سچ کی راہ

پر چلنے والے اور ظلم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے والے ابراہیم کی آل میں شمار ہوتے ہیں۔

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لئے ہزاروں برسوں سے انتظار کر رہی تھیں۔

اور میں وہی ہوں۔۔ چاند سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔

اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔

میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔

میرے سوتیلے عزیز تاریخ کو جتنا مسخ کر لیں مگر وہ میرے باپ کا نام کیوں کر مٹا سکیں گے۔ کہ پھر وہ خود بھی بے شناخت ہو جائیں گے۔

میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔

میں ابراہیم کا پوتا ہوں۔

میں آل ابراہیم سے ہوں۔

آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہو گئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔

"آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔"

یہ آسمانی آواز مجھے یقین دلاتی ہے کہ میری ایڑیوں کی رگڑ سے ایک چشمہ پھوٹ بہے گا اوراس کا پانی میری مدد کو آئے گا۔

مجھے جس اندھے کنوئیں میں گرایا گیا تھا آسمان سے اس میں اتنا پانی اترے گا کہ وہ کنواں چھلک پڑے گا اور بحر ہند کا ٹھاٹھیں مارتا پانی سیلاب بن جائے گا۔

اور پھر سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کے ایندھن میں بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی ساری آگ بجھ جائے گی۔

☆☆

میرے سوتیلے عزیزوں نے نفرت کی آگ لگادی ہے۔اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کررہے ہیں۔ میرے چاروں طرف آگ پھیلی ہوئی ہے۔۔۔سوتیلے جذبوں کی آگ.....مگر میں دیکھتا ہوں کہ:

میرے بن باس کے دن ختم ہو چکے ہیں۔میرا حق میرا تخت مجھے مل گیا ہے اور میری بیوی کی پاک دامنی کی شہادت خود تاریخ دے رہی ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ:

میری قید کی مدت ختم ہوگئی ہے۔اور میں ایک اعلیٰ منصب پر سرفراز کیا گیا ہوں۔اور چاند سورج اور ستارے میرے حضور سجدہ ریز ہیں۔

اور میں دیکھتا ہوں کہ:

تپتے ہوئے صحرا میں میرے ایڑیاں رگڑنے سے ایک چشمہ پھوٹ بہا ہے۔مری ماں کے چہرے پر خوشیوں اور مسرتوں کا نور پھیلا ہوا ہے۔ وہ جو کسی قافلے کی امداد کی منتظر تھی اب ہزاروں قافلے اس کی مدد کے محتاج ہیں۔اور اس بادشاہ زادی کو ایک نئی بادشاہت مل گئی ہے۔اور ہزاروں برس سے میرا انتظار کرنے والی کنواریاں، میرے گلے میں ڈالنے کے لئے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار سجائے میری آمد کے گیت گا رہی ہیں۔

اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بحر ہند کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی، آسمان سے اندھے کنوئیں

میں اتر کر اور پھر باہر چھلک جانے والا پانی اور میری ایڑیوں کی رگڑ سے پھوٹ بہنے والے چشمے کا پانی.....سب میری آنکھوں میں اتر آئے ہیں۔

سوتیلے جذبوں سے بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے اور اس آگ کے دوسری طرف میرے تمام سوتیلے عزیز حیرت اور خوف سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔

میں آگ کے مکمل طور پر بجھنے کا انتظار کرتا ہوں۔

میں انتظار کرتا ہوں جب تھوڑی دیر بعد میرے سارے سوتیلے عزیز مجرموں کی طرح میرے سامنے پیش ہوں گے۔

اور میں اس وقت کے آنے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔

”لا تثریب علیکم الیوم.....“☆

☆ترجمہ: آج کے دن تم سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔

☆☆☆

حیدر قریشی

گھٹن کا احساس

ہم نے بھوگا ہے صرف اسے حیدؔر
ہم نے کب زندگی گزاری ہے

بچپن میں اُس کی ماں اُسے نلکے کے نیچے بٹھا کر نہلایا کرتی تھی۔اس کا بھائی نلکے کی ہتھی چلاتا، ماں اُس کے پورے جسم پر صابن مَل کر اسے اچھی طرح سے صاف کرتی۔ ماں کا نہلانا اُسے اچھا لگتا تھا لیکن جب وہ اس کے منہ پر صابن لگاتی اور اسے آنکھوں میں اس کی چبھن محسوس ہوتی تب وہ تکلیف کے باعث اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا۔صابن سے بھی زیادہ گھبراہٹ اُسے اُس وقت ہوتی جب اُس کا سر نلکے کے پھن کے عین نیچے ہوتا۔ پانی سیدھا اُس کے سر اور چہرے پر امنڈتا چلا آتا اُسے ایسا لگتا جیسے وہ کسی گہرے پانی میں ڈوب رہا ہو۔ وہ گھبراہٹ کے مارے چیخنے لگتا۔ایسے موقعہ پر اس کا بھائی شرارت سے نلکے کی ہتھی کو زیادہ تیزی سے چلانے لگتا۔ اُس کی گھبراہٹ تڑپنے جیسی حالت میں بدل جاتی۔تب ماں اسے سینے سے لگا لیتی۔ ماں کے سینے سے لگتے ہی اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو جاتی۔

لڑکپن میں ایک بار اُسے اپنے باپ کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا موقعہ ملا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا تو خوفزدہ ہو گیا۔ وہ بلندی اور پانی دونوں سے ڈرنے لگا۔ اسے زمین سے جڑے رہنے میں عافیت محسوس ہونے لگی۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا بلندی اور پانی

سے اس کا خوف بڑھتا گیا۔ایک بار وہ ایک بائیس منزلہ عمارت کی آخری منزل پر گیا۔ بائیسویں منزل کے ایک فلیٹ کی بالکونی سے جب اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو اسے لگا وہ ابھی نیچے گر پڑے گا۔اس نے بالکونی سے پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ جڑ کر آہستہ آہستہ کمرے کی طرف سرکنا شروع کیا اور جب وہ تین میٹر کا فاصلہ طے کر کے بالکونی کے ساتھ ملحقہ کمرے میں گیا تو اس کا سانس ایسے پھولا ہوا تھا جیسے وہ ۳۰۰ میٹر کی دوڑ کے آخری پوائنٹ پر پہنچا ہو۔

۔۔۔۔جوانی میں ملازمت کے باعث اسے کئی گھر تبدیل کرنے پڑے۔اسے اتفاق کہیں کہ ہر گھر کا باتھ روم بے حد مختصر ہوتا۔نہانے والا سمٹ سمٹا کر شاور کے نیچے کھڑا ہو سکتا تھا۔کئی بار اس نے سوچا اس سے تو بچپن کا وہ نلکا اور کھرّا بہتر تھا۔وہاں ایسی گھٹن تو نہیں تھی۔تنگ باتھ روم میں جا کر کبھی کبھی اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی ملنگ ہے جو کسی شہزادی پر فریفتہ ہو گیا ہے اور بادشاہ نے اسے سزا کے طور پر دیواروں میں زندہ چُن دینے کا حکم دے دیا ہے۔تب وہ نہائے بغیر ہی گھبرا کر باہر نکل آتا۔نہاتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی پوری کمر پر نہیں پھر سکتا تھا۔ماں کا کمر پر صابن مَلنا یاد آتا تو اسکا جی چاہتا کاش ماں زندہ ہوتی اور اب بھی میری کمر پر صابن مَل دیتی۔

ایسے ہی خیالوں کے دوران ایک بار اُس نے اپنی بیوی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔اس کی بیوی نہ صرف اس کی ماں کی بھتیجی تھی بلکہ بڑی حد تک اس کی ماں کی ہم شکل بھی تھی۔اس نے اپنی بیوی سے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ نہاتے وقت اس کی کمر پر صابن مَل دیا کرے۔اس کی بیوی تھوڑا سا شرمائی پھر کہنے لگی:''مجھ سے یہ فلموں والے باتھ روم کے سین نہیں ہو سکتے'' وہ بیوی کے جملے پر مسکرایا اور سوچا یہ پگلی کہاں جا پہنچی۔ یوں بھی باتھ روم میں اتنی جگہ ہی کہاں ہے کہ وہ بھی میرے ساتھ سما سکتی۔

یک دن اس نے اخبار میں خبر پڑھی:ایک عورت جسے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا تھا دو دِن کی مشقّت کے بعد اپنی قبر اُدھیڑ کر باہر نکل آئی یہ خبر پڑھ کر اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ کسی زندہ انسان کو مردہ سمجھ کر دفن کر دینا۔لیکن قبر کے اندر لیٹا ہوا انسان کیسے اسے اُدھیڑ سکتا ہے؟ اس نے خوف اور حیرت سے سوچا۔ پھر اس نے فرض کیا کہ اسے بھی اسی طرح مردہ سمجھ کر دفن کر دیا

جائے تو وہ اپنی قبر اُدھیڑ سکے گا یا نہیں۔ وہ تو سچ مچ وہیں دَم گھٹ کر مر جائے گا اور پھر گھبرا کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ رات کو جب سردی کے باعث اس نے کمبل اپنے منہ پر لیا، اسے ایسے لگا جیسے وہ کفن میں لپٹا ہوا قبر میں پڑا ہے۔ اس نے گھبرا کر کمبل کو چہرے سے ہی نہیں، سینے سے بھی اُتار پھینکا اور بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بعد میں اس نے اپنے ایک دوست کو اپنی گھبراہٹ اور گھٹن کے احساس کے بارے میں بتایا تو اس نے اسے مشورہ دیا کہ تیراکی سیکھ لو۔ اب وہ اپنے دوست کو کیا بتاتا کہ وہ بچپن سے نلکے کے پانی سے بھی خائف ہے۔ تیراکی کیسے سیکھ لے! سو اس نے دوست کے مشورے کو مذاق کے رنگ میں ٹال دیا ''کیا پتہ کل کلاں مجھے مہینوال کا کردار کرنا پڑ جائے پھر دریا میں ڈوبنے کے بجائے تیر کر پار لگ جاؤں گا اور محبت کی رسوائی ہو جائے گی''

اس عرصہ میں اوزون کا مسئلہ، آلودگی کا مسئلہ اور ایٹمی جنگ کا امکانی خطرہ۔ ان موضوعات پر اس کا مطالعہ بڑھتا گا۔ وہ سوچتا: انسان نے مختلف نظریات اور مزعومہ برتری کی لڑائیوں میں نفرت کی آلودگی بڑھائی، بلندیوں کی آرزو میں اوزون میں شگاف ڈال دیئے، صنعتی ترقی اور اسلحے کی دوڑ میں ماں جیسے مقدس پانی کو ناپاک کر دیا، جنگلوں کو اُجاڑ دیا، اتنے ہولناک نیوکلیائی ہتھیار بنالئے کہ دھرتی کا دم گھٹ کر رہ جائے۔ یہ ساری بلندیاں انسانیت کو قبر میں گرانے والی ہیں۔ جیتے جی قبر میں گرانے والی۔ اور پھر اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔ ایسے ہی خیالوں میں کھویا ہوا وہ ایک بار ٹرین کا سفر کر رہا تھا۔ جب سوچتے سوچتے اس کا دم گھٹنے لگا وہ اٹھ کر ٹرین کے دروازے کے قریب آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اس نے گیٹ کے دائیں بائیں نصب شدہ دونوں ڈنڈوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اندر آتی ہوئی تیز ہوا سے گھٹن کا احساس کم ہونے لگا۔ اسے قدرے سکون مل رہا تھا لیکن پھر یکا یک اس کے ذہن میں عجیب سا خیال آیا۔ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دو۔ پھر یوں لگا جیسے یہ خیال نہیں کوئی غیبی آواز ہے جو اسے حکم دے رہی ہے: چھلانگ لگا دو۔ وہ گھبرا کر اپنی سیٹ کی طرف لوٹ آیا۔ اگر وہ مزید تھوڑی دیر گیٹ پر کھڑا رہتا تو یقیناً چھلانگ لگا دیتا۔ اس واقعہ کے بعد وہ کسی بھی بلندی والی جگہ جاتا، اسے یہی آواز سنائی دینے لگتی: نیچے چھلانگ لگا دو۔ چھلانگ لگا دو۔ اور وہ گھبرا کے نیچے آ جاتا۔

اُس دن وہ صوبائی دارالحکومت سے واپس آ رہا تھا۔ رستے میں ماں، باپ کی قبروں پر جانے کی آرزو ہوئی اس لئے ان کے شہر کی طرف چل پڑا۔ وہاں ان دنوں رستے میں دریا کا پُل زیرِ مرمّت تھا۔ کام کی وجہ سے ساری رات پُل پر آمدورفت معطل رہتی تھی۔ اسے اس کا علم نہیں تھا۔ لیکن اب دریا کے اس طرف آ گیا تھا تو دوسری طرف جا کر ماں، باپ کی قبروں پر دعا کئے بغیر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لئے وہ دریا کے اس طرف مزے سے رات بسر کر سکتا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ صبح رستہ کھلتے ہی دریا کے پار چلا جائے گا۔ لیکن رات دس بجے کے قریب ایک شخص اس کے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ وہ دریا کے دوسری طرف والے شہر کا باسی ہے اور ایک چھوٹے سے پُل سے واقف ہے جہاں سے پیدل دریا پار کیا جا سکتا ہے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اس شخص کے ساتھ چل پڑا۔ یہ بمشکل دو فٹ چوڑا پُل تھا جس کے ایک طرف لوہے کے پائپوں کا جنگلہ سا بنا تھا اور دوسری طرف سے بغیر جنگلے کے تھا۔ اس نے آدھا پُل بے خیالی میں پار کر لیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو پُل صراط پر چل رہا ہے۔ اس نے جنگلے کو پکڑے ہوئے اوپر دیکھا۔ ریلوے لائن والے پُل پر چندھیا دینے والی روشنی تھی۔ وہاں مزدور کام کر رہے تھے۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ نیچے نظر دوڑائی تو گرمیوں کا چڑھتا ہوا دریا تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ تب اسے جتنی دعائیں یاد تھیں اس نے ان کا وِرد شروع کر دیا ان میں علم میں اضافے سے لے کر والدین کی مغفرت تک کی کئی غیر متعلق دعائیں بھی شامل تھیں۔ نہ وہ اوپر دیکھ سکتا تھا نہ نیچے۔ تب اس نے اپنے آگے والے ہم سفر کو دیکھا تو وہ غائب تھا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کون تھا اور کیوں مجھے یہاں تک لا کر غائب ہو گیا۔ دریا کے دوسری طرف والے شہر کے رہنے والے نے مجھے دھوکہ کیوں دیا؟ ان خیالوں اور سوالوں کے ساتھ اس نے بے بسی سے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ ایک طرف گہری تاریکی تھی اور ایک طرف ٹرین کے پُل پر ہونے والی تیز روشنی۔ گھبراہٹ میں اس کا ایک ہاتھ جنگلے سے ہٹ گیا۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا جہاں دریا کا چڑھتا ہوا پانی تھا، اضطراری طور پر اس کا دوسرا ہاتھ بھی جنگلے سے ہٹ گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔ پھر اسے وہی آواز سنائی دینے لگی: چھلانگ لگا دو.... نیچے چھلانگ لگا دو۔ پھر دریا میں گہری

چھپاک کی آواز اس نے خود ہی سنی تھی۔ اس کے بعد اسے ایسا لگا جیسے اس کی ماں اسے نہلا رہی ہے۔ اس نے اس کے منہ پر صابن مَل دیا ہے۔ بھائی نے نلکے کی ہتھی تیز چلانی شروع کر دی ہے۔ گھبرا کر وہ تھوڑا سا تڑپا تو ماں نے بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگا لیا۔

اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو چکی تھی۔

☆☆☆

حیدر قریشی

آپ بیتی

اپنی کچھ نیکیاں لکھنے کے لئے بھی حیدرؔ
اپنے ناکردہ گناہوں سے سیاہی مانگوں

(۱)

اس دن ماں نے مجھے معمول کے مطابق فجر کے وقت جگایا تھا مگر اس کا لہجہ معمول کے مطابق نہ تھا۔ میں نے تاروں کی روشنی میں ماں کی آنکھوں میں تشویش جھلکتی دیکھی۔ ماں مشرق کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں گہری سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا آسمان پر شفق پھوٹنے کی بجائے خون پھوٹ بہا ہے۔

اس دن سارا شہر خوفزدہ تھا لوگوں کی نظریں اخبارات کی خبروں پر جم کر رہ گئیں۔

ٹریفک کے حادثے میں بیس افراد ہلاک اور تیس شدید زخمی۔

ملزمان پندرہ روز تک مجھے مسلسل بے آبرو کرتے رہے۔ برآمد کی جانے والی مغویہ کا بیان۔

ایک نوجوان نے محبت میں ناکام ہو کر محبوبہ کو ہلاک کر دیا۔

سگے باپ، بھائی اور بھابھی کو قتل کر دیا، خانگی جھگڑے کا شاخسانہ۔

ساری خبریں معمول کے مطابق تھیں مگر اس دن یہ ساری خبریں غیر معمولی لگ رہی

تھیں۔لگتا تھا ہر خبر کا آسمان کی سرخی سے کوئی تعلق بنتا ہے۔

اس دن شہر میں بہت سی بھڑیں آ گئی تھیں۔ پہلے شہر میں جس طرح مکھیاں بھنبھناتی تھیں اب ویسے ہی بھڑیں اڑتی پھرتی تھیں۔

اس دن شدید گرمی کے باعث میں نے قمیص اتار رکھی تھی اور بنیان پہنے اپنی کرسی پر بیٹھا اس دن کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ڈاک میں دیگر خطوط کے ساتھ میری ایک بہت ہی اچھی دوست کا خط بھی تھا۔ جونہی میں اس کا خط پڑھنے لگا مجھے اپنے سینے پر شدید جلن محسوس ہوئی۔ایک بھڑ نے میرے سینے پر ڈنک مارا تھا۔میں تکلیف کے عالم میں ماں کے پاس آیا تو اس نے لوہے کی کسی چیز کو ڈنک والی جگہ پر رگڑتے ہوئے دم کیا اور میری تکلیف بڑی حد تک دور ہو گئی پتہ نہیں اس دم کی وجہ سے یا ماں کی وجہ سے یا شاید دونوں کی وجہ سے!

اس دن شام کو غروبِ آفتاب کے بعد آسمان کی طرف پھر ویسی ہی گہری سرخی چھا گئی اور دن بھر کے پریشان لوگ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئے یہ سارے واقعات صرف اس دن ہی غیر معمولی لگے۔طلوعِ آفتاب سے پہلے اور غروبِ آفتاب کے بعد اب بھی آسمان گہرا سرخ ہوتا ہے۔ بھڑیں اب بھی شہر میں دندناتی پھرتی ہیں۔قتل،اغوا،ایکسیڈنٹ اور آبروریزی کے واقعات اب بھی ہوتے ہیں مگر لوگ اب پہلے کی طرح پریشان نہیں ہوتے۔انہوں نے آسمان کی سرخی کو بھی معمولاتِ زندگی میں شمار کر لیا ہے۔لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میری ماں کی آنکھوں میں ابھی تک تشویش جھلک رہی ہے۔ وہ اپنی تشویش سے آگاہ کر کے مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتی لیکن میں نے راتوں کو دیکھا ہے کہ وہ کئی دفعہ اٹھ اٹھ کر،آسمانی صحیفوں کی دعائیں پڑھ پڑھ کر، مجھے سوتا جان کر مجھ پر دم کرتی رہتی ہے۔ایک دو دفعہ میں نے سنا وہ میرے باپ سے آہستہ آواز میں اپنی تشویش کا اظہار کر رہی تھی اور میرے باپ نے آسمان کی سرخی کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر کرتے ہوئے کہا تھا کہ دنیا پر عنقریب بہت بڑی تباہی آنے والی ہے۔اپنی ماں اور باپ کی اس تشویش کو دیکھ کر مجھے بھی کبھی کبھی تشویش ہونے لگتی ہے۔

جب پہلے پہل لوگوں نے خوف کا اظہار کیا تھا تب وہ بھی اس آسمانی تبدیلی کو اجتماعی

زاویے سے دیکھ رہے تھے اور میرے ماں باپ بھی اسے کسی اجتماعی تباہی کا پیش خیمہ سمجھ رہے ہیں۔لیکن ماں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر مجھے کیوں دَم کرتی رہتی ہے؟اس سوال نے مجھے اس سارے معاملے کو انفرادی زاویے سے دیکھنے کی تحریک کی ہے اور میں آسمان کی سرخی کو اپنی ذات کے حوالے سے سوچنے لگتا ہوں۔

(۲)

''رات دو بجے....عقبی دروازہ.....ٹھیک!''

میں اس بے ربط مگر معنی خیز تحریر کو پڑھتا ہوں اور اس خوبصورت لڑکی کا سراپا مجھے اپنے پورے وجود میں خوشبو بکھیرتا محسوس ہوتا ہے جو ایک عرصے سے میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔میری ایک بہت ہی اچھی دوست نے مجھے کئی دفعہ اس خوبصورت لڑکی سے لاتعلقی کی نصیحت کی تھی۔مگر میں نے ہمیشہ اس کی نصیحت کو نظر انداز کیا۔اور آج جب اس خوبصورت لڑکی نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا ہے تو میرے ذہن میں خود بخود گناہ کا تصوّر ابھرنے لگتا ہے۔ماں سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے میں بیٹھک میں آ کر بظاہر سو جاتا ہوں۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں اور میں نے لیٹے ہی لیٹے دائیں طرف کروٹ بدل کر خیال ہی خیال میں اس خوبصورت لڑکی کو اپنے پہلو میں سلا لیا ہے۔میری سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔اور عین اس وقت جب میں کلائمکس پر پہنچنے لگا ہوں میں نے اس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لینا چاہا ہے....مگر مجھے جیسے یکدم کرنٹ لگ گیا ہے۔میرے ہاتھوں میں جو چہرا ہے وہ ہو بہو میری بیٹی کا ہے۔میری ننھی بچی....جیسے ایک دم جوان ہو کر میرے ساتھ لیٹی ہو۔میں خوف زدہ ہو کر بیٹھک سے نکل کر باہر سڑک پر آ جاتا ہوں۔اور کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں۔

کافی دیر بعد میں دوبارہ اندر آتا ہوں۔نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ میں پھر بستر پر لیٹ جاتا ہوں مگر خوف کے باعث اب بائیں کروٹ لیٹتا ہوں۔ لیٹتے ہی وہ خوبصورت لڑکی پھر میرے پہلو میں آ گئی ہے اور.....اور....نہ چاہتے ہوئے بھی میں پھر اس کے جسم کو اپنی

بانہوں میں سمیٹ کر اپنے پورے وجود میں سمونے لگتا ہوں۔ اپنے سارے عمل کے دوران میں شعوری طور پر کوشش کرتا ہوں کہ اس کا چہرہ نہ دیکھوں۔ مگر ....اس نے اپنے ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام لیا ہے میں قدرے جھجکتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ یہ چہرہ میری بیوی کا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میری بیوی ایک ماہ سے میکے گئی ہوئی ہے۔ اس کی عدم موجودگی کے باوجود اس کی موجودگی میں کوئی حرج نہیں۔ میں اس کے جسم کو اور بھینچ لیتا ہوں۔لیکن مجھے پھر کرنٹ لگتا ہے.... میں نے اپنے آپ کو دیکھا تو میری جگہ کوئی اور تھا۔

میں پھر خوفزدہ ہو کر سڑک پر نکل آتا ہوں اور کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آسمان کی خونی سرخی دراصل میرے اس ہونے والے ریپ کی گواہ اور اس خوبصورت لڑکی کے بہنے والے خون کا ثبوت ہے۔لیکن ہم دونوں میں اصل مجرم کون ہے؟

مری اس اچھی دوست نے ایک دفعہ جھلا کر مجھے کہا تھا ”آپ دونوں ایک دوسرے کے لئے مخلص نہیں ہیں صرف اپنے جذبات کی تسکین کے لئے ایک دوسرے سے فراڈ کر رہے ہیں“.....لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بڑے بڑے مخلص دوستوں کو بھی ذاتی مفاد کی خاطر انتہائی گھٹیا سطح پر اترتے دیکھا ہے خود میری اس اچھی دوست نے میرے ساتھ زبردست فراڈ کیا ہے۔ ایسا فراڈ جو ابھی تک وہ خوبصورت لڑکی بھی میرے ساتھ نہیں کر سکی۔



عشق کے روایتی قصوں میں ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں مگر رات کو کسی سے چوری چھپے ملنے جانا میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ گہری سیاہ رات میں پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں لیکن جب میں اس کے دروازے پر ہلکی سی دستک دینے لگتا ہوں تو اچانک روشنی میں نہا جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے سارا شہر میرے تعاقب میں نکل آیا ہے اور میں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہوں۔ میں گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ میرے چاروں طرف گھور اندھیرا ہے، پھر میں کس روشنی میں نہا گیا ہوں؟ کہیں یہ مرے اندر کی روشنی تو نہیں؟....مرے شجرے کی روشنی؟

دروازہ کھل گیا ہے اور میں اپنے سوالوں کے جواب سوچے بغیر اندر داخل ہو گیا ہوں۔

کمرے میں صرف ایک چار پائی اور ایک کرسی پڑی ہے،لیکن ہم دونوں چار پائی پر ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔ اس نے اپنی کمر کا بوجھ مرے اس بازو پر ڈال رکھا ہے جو میں نے اس کی کمر میں حمائل کر رکھا ہے۔ گپ شپ کرتے ہوئے اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری بیوی اور میری بیٹی دونوں میرے دائیں بائیں آن کھڑی ہیں۔ وہ دونوں مجھے میرے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیتی ہیں، سامنے میری وہ اچھی دوست اپنا منہ دوسری طرف پھیرے کھڑی ہے۔ میں عین موقعہ پر پکڑ لئے جانے کی شرمندگی کے ساتھ باہر آنے لگتا ہوں۔ وہ خوبصورت لڑکی مجھے حیرت سے دیکھتی ہے۔

واپس آ کر میں ٹائم دیکھتا ہوں۔ تین بج رہے ہیں۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے گہری نیند آ جاتی ہے.....

ماں حسب معمول فجر کے وقت مجھے جگاتی ہے تو میں بمشکل آنکھیں کھول پاتا ہوں۔ ماں کے چہرے پر فکرمندی کے گہرے اثرات ہیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتاتی ہے کہ آج آسمان پہلے سے بھی زیادہ سرخ ہے۔ میں کمرے سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر حیرت سے ماں کا چہرہ تکنے لگتا ہوں۔

”ماں! آج تو آسمان پر معمولی سرخی بھی نہیں ہے۔ بالکل صاف آسمان ہے“

ماں مجھے تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے اور پھر غالباً مجھ پر دَم کرنے کے لئے کوئی آیت پڑھنے لگتی ہے....میں کمرے میں آ کر بڑے آئینے کے سامنے اپنے بال درست کرنے لگتا ہوں، بال درست کرتے ہوئے مجھے اپنی آنکھیں لال انگاروں کی طرح نظر آتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے آسمان کی ساری سرخی مری آنکھوں میں اتر آئی ہے۔ میں نے انفرادی زاویے سے آسمانی سرخی کا بھید پالیا ہے....ماں کمرے میں آ کر مجھ پر پھونکیں مارتی ہے، مجھے لگتا ہے وہ کہنا چاہتی ہے کہ مجھے تمہارے رات کے سارے عمل کا پتہ ہے لیکن پھر میرے شرمندہ ہونے کا خیال کر کے چپ چاپ لوٹ جاتی ہے۔ میں وضو کرنے کے لئے باہر آنے لگتا ہوں تو ایک کتاب پر ایک بھڑ کو بیٹھا دیکھتا ہوں....ایک دوسری کتاب اٹھا کر میں نے اس بھڑ پر دے ماری ہے اور اسے اس کے ڈنک سمیت ختم کر دیا ہے....اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی اس اچھی دوست کا خیال آ جاتا ہے جس کی ایک

زیادتی کے باعث میں اس سے ناراض ہوں۔

ممکن ہے وہ بھی اپنی زیادتی پر نادم ہو اور اس ندامت کا احساس آسمان کی ساری سرخی اس کی آنکھوں میں بھی بھر دے.... ممکن ہے آج شام کو غروبِ آفتاب کے بعد مری طرح اسے بھی آسمان خون آلود نظر نہ آئے اور وہ بھی میری طرح انفرادی زاویے سے آسمان کی سرخی کا بھید جان لے....اور ممکن ہے وہ بھی کسی بھڑ کو اس کے ڈنک سمیت مار دے۔

میں اس خوبصورت لڑکی کے بارے میں بھی کچھ سوچنا چاہتا ہوں لیکن فی الحال میں طے کرتا ہوں کہ آج ناشتے کے بعد تازہ اخبار کا مطالعہ نہیں کروں گا۔قتل، اغوا، زنا، ایکسیڈنٹ کی خبریں تو روز کا معمول ہیں۔آج میں ناشتے کے بعد اپنی اس اچھی دوست کا خط پڑھوں گا جس سے میں ناراض ہوں۔

وہی خط جسے پڑھتے وقت بھڑ نے میرے سینے پر ڈنک مارا تھا۔

☆☆☆

حیدر قریشی

روشنی کی بشارت

بدل جاتے ہیں اک لمحے میں ہی تاریخ کے دھارے
کبھی جو موج میں آکر قلندر بول اُٹھتے ہیں

’’دیوانہ خاموش ہو گیا اور اپنے سامعین کو دیکھنے لگا۔وہ بھی خاموش تھے اور حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔بالآخر اس نے چراغ زمین پر پٹخ دیا جو ریزے ریزے ہو کر بجھ۔گیا۔تب اس نے کہا:
’’میں بہت پہلے آگیا ہوں میرا تعلق مستقبل سے ہے۔یہ مہیب واقعہ ابھی فاصلے ہی طے کر رہا ہے‘‘ (نیطشے کی ایک تمثیل سے اقتباس)

اپنی آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ، مٹی کا چراغ اپنے ہاتھوں پر اٹھائے جب میں شہر کے لوگوں کو روشنی کی بشارت دیتا ہوں تو وہ مجھے اس انداز سے دیکھتے ہیں جیسے میں ان کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔کچھ لوگ میری بات پر ہنستے ہیں۔کچھ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے آگے چلے جاتے ہیں۔کچھ سر اٹھا کر دیکھے بغیر کچھ سوچتے چلے جاتے ہیں۔

میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ مٹی کا چراغ میرے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن کوئی بھی میری بشارت پر ایمان نہیں لا رہا۔مجھے شک گزرتا ہے۔میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں۔یہ لوگ مجھ سے سولہ سو برس پیچھے ہیں۔یہ میری بات نہیں سمجھ پائیں

گے۔ پھر کچھ سوچ کر میں اپنی ماں کے پاس جاتا ہوں اور روشنی کی بشارت دیتے ہوئے اسے بتاتا ہوں کہ میری آنکھوں میں سورج طلوع ہو رہے ہیں اور میرے ہاتھوں میں مٹی کا یہ چراغ ان کا گواہ ہے۔ میری ماں مجھے تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے اور آسمانی صحیفوں کی دعائیں پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکوں سے دَم کرنے لگتی ہے۔ میری چھوٹی بہن مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ہے اور دبک کر ماں کے قریب ہو جاتی ہے۔ ماں کی سادگی اور بہن کے بھولپن پر افسردہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے میں مبارکہ کے پاس آتا ہوں اور اسے بتاتا ہوں کہ میں دنیا کو روشنی کی بشارت دینے کے لئے مامور کیا گیا ہوں۔ میری آنکھوں میں سورج طلوع ہو رہے ہیں اور میرے ہاتھوں میں مٹی کا یہ چراغ ان کا گواہ ہے۔ مگر وہ میری بات پر توجہ دینے کی بجائے مجھے دوکانداروں کے بلوں اور بچوں کی فیسوں کے بارے میں بتانے لگتی ہے۔ میں مایوس ہو کر عفت کے پاس چلا آتا ہوں۔ پہلے تو وہ میری بات پر توجہ نہیں کرتی لیکن جب میں پوری سنجیدگی سے اپنی بات دہراتے ہوئے اصرار کرتا ہوں کہ اب روشنی صرف میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں سے ہی اترے گی۔ تو وہ میرے قریب آ جاتی ہے۔۔ میرے ہاتھوں میں مٹی کے چراغ کو چھو کر دیکھتی ہے اور پھر پوچھتی ہے۔۔ کہیں آپ افسانہ لکھنے کے موڈ میں تو نہیں ہیں؟۔۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کے باوجود وہ مجھے اسی موضوع پر افسانہ لکھنے کی تحریک کرتی ہے۔

مجھے اب پوری طرح یقین ہو جاتا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے اس سے پہلے ایک دفعہ میں اپنے وقت سے پچاس برس پہلے آیا تھا اور جب پچاس برس بعد میں دوبارہ آیا تھا تو میں نے یہ دیکھا تھا کہ میں اپنے وقت سے ایک صدی پہلے آ گیا ہوں.... پھر جب میں ایک صدی بعد آیا تو میری آمد اپنے وقت سے دوسو سال پہلے تھی۔ اور جب میں دوسو سال بعد آیا تو میری آمد میں چارسو سال رہتے تھے اور پھر جب میں چارسو سال بعد آیا تو میں اپنے وقت سے آٹھ سو سال پہلے آیا ہوا تھا۔ اور اب جب میں آٹھ سو سال بعد آیا ہوں تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو سال پہلے آ گیا ہوں۔

میں جو روشنی کی بشارت ہوں۔ ہر لحظہ اس دنیا سے دور ہو رہا ہوں وہ کون سی صفر مدّت ہے۔ جس میں یہ تمام صدیاں اور زمانے سمٹ آئیں گے اور میری آمد قبل از وقت نہ ہوگی۔ وہ صفر مدّت جب انسان نور کا انکار کر کے آگ کی بھینٹ نہیں چڑھے گا۔ مجھے اس مدّت کا انتظار کرنا ہوگا۔

اب جب میں سولہ سو برس کے بعد آؤں گا تو میری آمد میں بتیس سو سال رہتے ہوں گے۔ اور جب میں بتیس سو سال بعد آؤں گا تو میری آمد میں چونسٹھ سو سال رہتے ہوں گے۔ اور اسی طرح کئی ہزار برس بیت جائیں گے۔ لیکن وہ صفر مدت کب آئے گی جب میرا آنا بروقت ہوگا۔ اور جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوا نیزے کی انی پر آ جائیں گے۔ تب کوئی انکار کی جرأت نہ کر سکے گا۔ میں اپنے گزرے ہوئے اور آنے والے برسوں کا بوجھ اپنی روح پر اٹھائے پھر شہر میں آتا ہوں۔ شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہنچ کر میں اعلان کرتا ہوں:

''لوگو! تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لا کر خود کو روشنی سے محروم کر لیا ہے...''

میرا اعلان مکمل ہونے سے پہلے ہی لوگ تمسخر شروع کر دیتے ہیں۔ مختلف سمتوں سے گالیاں اور تضحیک آمیز فقرے میری طرف آ رہے ہیں۔ میں کمال ضبط سے تمام تمسخرانہ اور تضحیک آمیز فقرے برداشت کرتا ہوں۔ جب لوگ فقرے بازی سے خود ہی تھک جاتے ہیں تو میں اپنا پہلا اعلان ادھورا چھوڑ کر نیا اعلان کرتا ہوں:

''لوگو! تم نے روشنی کی تحقیر کی ہے۔ نورِ بصیرت سے محروم لوگو! تم میں سے اب صرف وہی لوگ بچائے جائیں گے جو میرے گھر کی دیواروں کی اوٹ میں پناہ لیں گے۔ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں لیکن آگ تمہارا مقدر ہو چکی ہے۔''

یہ کہہ کر میں اپنا چراغ شہر کے چوراہے پر توڑ دیتا ہوں اور خود تیزی سے اپنے گھر کی طرف چلا آتا ہوں۔ لوگوں کے قہقہے گھر تک میرا تعاقب کرتے ہیں۔ لیکن میرے گھر پہنچنے تک وہ قہقہے چیخوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ مٹی کے اس چراغ سے سارے شہر میں آگ لگ جاتی ہے۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتا ہوں۔

سارے شہر میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اور لوگوں کی چیخیں ایک بھیانک شور

میں تبدیل ہوگئی ہیں میری ماں حیرت سے کبھی میرے کمرے میں آ کر مجھے دیکھتی ہے اور کبھی گھر کے صحن میں جا کر دھڑا دھڑ جلتے ہوئے شہر سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھتی ہے۔ میری چھوٹی بہن اسی طرح خوفزدہ انداز میں ماں کے ساتھ ساتھ ہے۔ پھر وہ ماں کو کھینچ کر میرے کمرے میں بٹھا لیتی ہے اور خود دبک کر ماں کے اور بھی قریب ہو جاتی ہے۔

مبارکہ اور عفت دونوں میرے کمرے میں آتی ہیں۔ دونوں کے چہروں سے حیرت جھلک رہی ہے۔ ایک گھمبیر خاموشی کے بعد مبارکہ ہمت کر کے بولتی ہے،

''باہر بہت سارے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں''

''اب ان کا ایمان لانا یا نہ لانا ایک برابر ہے... جو لوگ دیواروں کی اوٹ میں ہیں انہیں ویسے بھی کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ میں اب بیعت نہیں لے سکتا۔ میں اب سولہ سو برس کے بعد آؤں گا۔ پھر بتیس سو برس کے بعد پھر چونسٹھ سو برس کے بعد۔۔ پھر۔۔''

مبارکہ اور عفت کے چہروں سے عقیدت کے ساتھ دہشت بھی ٹپکنے لگتی ہے۔

میری چھوٹی بہن دبک کر ماں کے کچھ اور قریب ہو جاتی ہے۔

میری ماں اپنی خالی آنکھوں میں ان لمحوں کو اتارنے کی کوشش کر رہی ہے جب اس نے مجھے جنم دیا تھا اور میں اس صفر مدت کا انتظار کرنے لگتا ہوں جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوا نیزے کی انی پر اتر آئیں گے۔ جب وہ اپنے گواہ آپ ہوں گے اور جب مٹی کا کوئی چراغ گواہی کے لئے نہیں لانا ہوگا۔

☆☆☆

میری ماں اور چھوٹی بہن سامنے بینچ پر بیٹھے ہیں۔ مبارکہ میری نبض دیکھتے ہوئے بتاتی ہے، ''ابھی تھوڑی دیر پہلے عفت آپ کی عیادت کے لئے آئی تھی۔ مگر آپ سوئے ہوئے تھے۔ اب وہ پھر تھوڑی دیر بعد آئے گی۔''

اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں کس صفر مدت کا انتظار کر رہا ہوں!

☆☆☆

حیدر قریشی

مسکراہٹ کا عکس

روشنی کا استعارہ کر لیا
دل نے ہر آنسو ستارہ کر لیا

ایک بہت بڑے فریم میں ابا جی کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگا کے میں نے فریم کو اپنے ڈرائنگ روم میں آویزاں کر رکھا ہے۔ گھر کے باقی کمروں میں بھی ان کی چھوٹی چھوٹی تصویریں سجا رکھی ہیں اور یہ ساری تصویریں میرے من میں بھی سجی ہوئی ہیں۔ گو انہیں فوت ہوئے ایک زمانہ ہو گیا ہے لیکن ان تصویروں کے باعث مجھے گھر میں ان کی موجودگی کا گمان رہتا ہے۔ ڈرائنگ روم والی بڑی تصویر اس لحاظ سے باقی ساری تصویروں سے الگ ہے کہ اس میں ابا جی کے چہرے پر ولیوں جیسی شان بے حد نمایاں ہے۔ میک اپ کر کے اپنے چہرے پر نُور ظاہر کرنے والے نام نہاد مقدس لیڈروں سے مختلف، اپنے اندر کی روشنی سے منوّر ابا جی کا چہرہ۔ اور پھر اس چہرے میں دو جگمگاتی آنکھیں۔ ان جگمگاتی آنکھوں میں عجیب اسرار ہیں۔ میں کبھی کوئی بہت اچھا اور نیکی کا کام کرتا ہوں تو ابا جی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دکھائی دیتی ہے۔ میں سب سے بچ بچا کر اور چھپ چھپا کر بھی کوئی برا کام کر بیٹھوں تو ابا جی کی آنکھوں سے برہمی بلکہ تادیب کی لَو بھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔

کسی نے مجھ سے زیادتی کی۔۔۔ میں نے اس سے برابر کا بدلہ لے لیا۔ ابا جی کی

آنکھوں کی اداسی جیسے بولنے لگتی ہے: اس نے تمہیں دُکھ پہنچایا، برا کیا۔تم نے فوراً بدلہ لے لیا۔کیا مل گیا بدلہ لے کر؟ کبھی دکھ کو سہہ جانے کا مزہ بھی چکھ کر دیکھو!

بعض بھائیوں نے میرے ساتھ ہاتھ کیا، میں نے انہیں سبق سکھانا چاہا تو ابا جی کی دکھ سے بھری آنکھیں مجھے نصیحت کرنے لگیں: تم سارے بھائی میرے ہی وجود کی شناخت ہو۔وہ چھوٹے ہیں، نادان ہیں۔انہیں نقصان پہنچاؤ گے تو وہ بھی تمہارا نقصان ہوگا۔تم جیتو یا ہارو، دونوں صورتوں میں خود ہی ہارو گے اور مجھے ہی ہراؤ گے۔

کبھی کبھی تو ایسے لگتا ہے جیسے میں ٹین ایج میں ہوں اور ابا جی ہمہ وقت جا، بے جا مداخلت کر کے مجھے اپنے بنائے ہوئے سیدھے رستے پر چلائے رکھنا چاہتے ہیں اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ فریم میں ابا جی کی تصویر نہیں، ایک آئینہ ہے۔میں اس کے روبرو ہوتا ہوں تو گویا اپنے روبرو ہوتا ہوں۔مجھ پر میرے اندر سے اچھائی اور برائی کا فرق منکشف ہونے لگتا ہے۔نیکی اور خیر کی تحریک ملنے لگتی ہے۔

ایک بار میں نے اپنے تینوں بیٹوں کی ابا جی کے ساتھ تصویر کھینچی تھی۔ٹیپو، ابا جی کی گود میں تھا اور زلفی، شازی اُن کے دائیں، بائیں۔مدت کے بعد اس تصویر کو دیکھا۔میں تصویر میں موجود نہیں تھا لیکن میں نے ہی تو تصویر کھینچی تھی۔سو اِس تصویر میں اپنی موجودگی، اپنی شرکت کا احساس جاگا۔اپنے تینوں بیٹوں اور ابا جی کی گروپ تصویر کو دیکھ کر میں جیسے درجۂ شہود میں داخل ہو گیا۔مجھے محسوس ہوا کہ میرے وجود میں میرے ماضی، حال اور مستقبل کے تینوں زمانے یک جا ہو گئے ہیں۔سارا زمان ایک نقطے میں ڈھل گیا ہے۔شاہد و مشہود کی تفریق ختم ہو گئی ہے۔لیکن اگر واقعی ایسا ہے تو پھر ابا جی مجھے روکتے، ٹوکتے کیوں رہتے ہیں؟۔تب ہی نقطۂ زماں پھیلنے لگا اور میں اپنے لڑکپن سے جوانی کے دور میں داخل ہونے لگا۔ہر نصیحت سے غافل اور بیگانہ۔خواہشات کا اژدہام تھا اور میں تھا۔میں منزلوں پر منزلیں مار رہا تھا۔خواہشات کی نوعیت بدلتی گئی، عمر ڈھلتی گئی لیکن خواہشیں جہنم کی طرح ہل من مزید پکارتی رہیں۔بے شک انسان حریص ہے کہ اسے سونے کا پہاڑ مل جائے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے ویسے ہی ایک اور پہاڑ کی خواہش کرنے لگے گا۔

خواہش کے جہنم کا کوئی انت نہیں ہے، اس سے نکل آنے میں عافیت ہے۔اور پھر میں اپنے گوتم کے پاس آ گیا۔خواہشوں کے جہنم سے نکل آنے کے بعد ابا جی سے ملاقات ہوئی۔ان کی آنکھوں میں بیک وقت خفگی اور خوشی کا تاثر تھا:

’’خواہش پوری ہونے پر تسکین نہیں ہوتی بلکہ حرص کا روپ دھار لیتی ہے۔جتنی خواہشیں پوری ہوتی جاتی ہیں اتنا ہی حرص بڑھتا جاتا ہے۔یہ پیاس اور یہ آگ کبھی بھی نہیں بجھتی۔خواہشیں بے انت سراب کی ٹھاٹھیں مارتی لہریں ہیں!‘‘

’’ابا جی! میں جوگی نہیں ہوں۔صوفی اور تیاگی نہیں ہوں۔ان سب کی جی جان سے عزت کرتا ہوں لیکن ان جیسا بننا نہیں چاہتا، میں آپ جیسا ہی بننا چاہتا ہوں۔زندگی کو بھوگتے ہوئے اپنی ریاضت، اپنی تپسّیا مکمل کرنا چاہتا ہوں لیکن آپ کے برعکس میری خواہشیں، حرص میں ڈھلنے لگتی ہیں اور میری ساری ریاضت برباد ہو جاتی ہے، ساری تپسیا بھنگ ہو جاتی ہے۔اور ابا جی! آپ نے مجھے کبھی قناعت کا درس بھی تو نہیں دیا تھا۔شاید اسی لئے خواہشوں کو مکمل طور پر تیاگ دینا میرے لئے ممکن نہیں ہے‘‘

یہاں تک بات کرتے کرتے میری آنکھوں کا پانی پلکوں تک آ گیا تھا۔پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسوؤں نے سارا منظر دھند میں لپیٹ دیا تھا۔لیکن یہ کیا؟

دراصل ہمارے اندر کی دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اندر ہی اندر ہوتا ہے۔باہر کی، ظاہر کی دنیا سے یہ سب کچھ الگ تھلگ ہوتا ہے۔اپنے اندر کی دنیا میں مگن رہنے کے باوجود میں اندر اور باہر کی دنیاؤں کے اس فرق کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ابا جی کی تصویر سے میرے تعلق کی نوعیت بھی حقیقتاً داخلی تھی۔ظاہر کی دنیا کے حساب سے تو شاید ایسا کچھ بھی نہیں تھا لیکن میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بھی پوری طرح دیکھا تھا کہ ابا جی سچ مچ تصویر کے فریم سے باہر نکلے، اور صوفے پر آ کر میرے ساتھ بیٹھ گئے۔انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ اپنی پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے۔لیکن آنسو تو امڈتے ہی چلے آتے تھے۔جیسے سیلاب بن کر خواہشوں کے اژدہام کو بہا لے جانا چاہتے تھے۔تب ابا جی نے بیٹھے ہی بیٹھے مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا۔شاید وہ

بول نہیں سکتے تھے اور اسی طرح مجھے دلاسہ دے رہے تھے۔ پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے جانے اور ابا جی کا مجھے خود سے لپٹانے کا میرا تجربہ خیالی یا روحانی قطعاً نہیں تھا۔ یہ مکمل طور پر جسمانی اور ظاہری وقوعہ تھا۔

میں نے آنکھوں کو اچھی طرح صاف کیا اور آنسوؤں کی دھند کو ہٹا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میرے تینوں بیٹے میرے پاس تھے۔ ٹیپو نے مجھے بانہوں میں بھینچ رکھا تھا، شازی میرا کندھا دبا رہا تھا سامنے زلفی کھڑا تھا اور اس کے ہاتھوں میں بھیگا ہوا رومال تھا۔

''ابا جی! آپ ٹھیک تو ہیں؟ آپ کو بیٹھے بیٹھے کچھ ہو گیا تھا۔ کیا ڈاکٹر کو بلا لیں؟''

پتہ نہیں تینوں بیٹوں میں سے کون بول رہا تھا۔

مجھے ایسے لگا جیسے ابا جی کے ساتھ میرے دادا جی اور پردادا جی بھی میری عیادت کے لئے آئے ہوئے ہیں اور میرے پوتے اور پڑپوتے بھی میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ زمان کو پھر ایک نقطے میں سمٹتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ میں نے سامنے ٹنگی ہوئی ابا جی کی تصویر کی طرف دیکھا تو اُن کے ہونٹوں پر بھی مجھے اپنے جیسی مسکراہٹ دکھائی دی۔ جلتی، بجھتی، چمکتی مسکراہٹ۔

پتہ نہیں ابا جی کی تصویر کے ہونٹوں پر میری مسکراہٹ کا عکس تھا یا میرے ہونٹوں پر ابا جی کی مسکراہٹ کا عکس تھا!

☆☆☆

حیدر قریشی

اپنے وقت سے تھوڑا پہلے

خواہش تھی کہ اک بار کبھی خود سے بھی ملتے
فرصت کبھی اے گردشِ حالات عطا کر

جرمنی کی مصروف ترین زندگی میں معمولاتِ زندگی مشینی انداز سے گزر رہے ہیں۔ مجھے نہ صرف بہت سارے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات نہ ہو سکنے کی حسرت رہتی ہے بلکہ کبھی کبھار تو خود سے ملنے کی بھی شدید خواہش ہوتی ہے۔ لیکن یہاں مکروہاتِ دنیا سے یا معمولاتِ زندگی سے مہلت ہی نہیں مل رہی۔ مجھے اتنا اندازہ ہے کہ میرے اندر میرے باہر سے زیادہ بہتر، کچھ ہے۔ لیکن جہاں بدن کے تقاضوں سے ہی جان نہ چھوٹ رہی ہو وہاں اندر کی طرف دھیان کہاں جا سکتا ہے۔

ڈیوٹی پر آنے جانے سمیت دس گھنٹوں کی مشقت کے بعد ساڑھے نو بجے شب کو گھر پہنچتے ہی پہلے لباس تبدیل کرتا ہوں، باتھ روم سے فارغ ہوتا ہوں۔ پھر انٹرنیٹ پر آئی ہوئی ای میلز دیکھتا ہوں اور ان کے جواب لکھتا ہوں۔ دس بجے شب ٹیلی کاسٹ ہونے والے جیو ٹی وی کے خبرنامہ کے پہلے پندرہ بیس منٹ کی خبریں دیکھنا میرا معمول ہے اور اسی دوران ہی رات کا کھانا کھاتا ہوں۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لئے باہر سیر کرنے کے لئے نکل جاتا ہوں۔ دس منٹ کی سیر کے بعد واپس آ کر مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کر کے پڑھتا ہوں۔ گیارہ بجے کسی اہم ٹاک

شوکو دیکھتا ہوں اور دیکھتے دیکھتے ہی صوفے پر سو جاتا ہوں۔صبح فجر کی نماز کے وقت پر جاگ جاتا ہوں۔حوائجاتِ ضروریہ کے بعد نماز،قرآن کی بچپن کی پڑی ہوئی عادت پوری کرتا ہوں۔اس دوران بیوی بچے بھی جاگ جاتے ہیں۔سب اپنے اپنے کام پر جانے کی تیاریوں میں مشغول ہوتے ہیں۔بیوی ناشتہ تیار کرتی ہے تو ہم دونوں مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔پھر میں کچھ دیر کے لئے سو جاتا ہوں۔

دس بجے کے لگ بھگ جاگ کر تازہ دَم ہوتا ہوں۔کچھ وقت انٹرنیٹ پر گزارتا ہوں۔ پھر ملازمت پر جانے کی تیاری کرتا ہوں۔سوا بارہ بجے والی بس مجھے میرے گھر کے پاس سے مل جاتی ہے۔بس پر بیٹھ کر اپنے شہر ہیڑس ہائم کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچتا ہوں۔وہاں سے مجھے فرینکفرٹ شہر تک جانا ہوتا ہے۔پلیٹ فارم نمبر۳ پر فرینکفرٹ جانے والی ٹرین آتی ہے جبکہ پلیٹ فارم نمبر۲ پر فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آتی ہے۔میں سیڑھیوں کے قریب اپنی ٹرین کا انتظار کرتا ہوں۔میری ٹرین سے تین منٹ پہلے فرینکفرٹ سے ٹرین آجاتی ہے اور اس کے آگے جانے تک میری اپنی ٹرین پہنچ جاتی ہے۔میں اپنی ٹرین کے آگے والے ڈبے میں بیٹھا کرتا ہوں کہ وہاں سے مجھے اپنی اگلی منزل کی طرف جانے میں چند قدموں کے چلنے کی بچت ہو جاتی ہے۔اس حساب سے چونکہ میں فرینکفرٹ جانے والی ٹرین کے پہلے ڈبے کے مقام پر کھڑا ہوتا ہوں،اس لئے فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کا آخری ڈبہ میرے قریب آکر رُکتا ہے۔یوں میں تین منٹ کے عرصہ میں اس ٹرین سے اترنے والی سواریوں کو سرسری سا دیکھ لیا کرتا ہوں۔ہم سب آنے اور جانے والے مزدور اور دفتر پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔اس لئے تقریباً سارے چہرے عام طور پر جانے پہچانے سے ہوتے ہیں۔ایک دن میں نے معمول کے مطابق فرینکفرٹ کی طرف سے آنے والی سواریوں کو دیکھنے کی بجائے ویسے ہی اپنے پلیٹ فارم پر اپنی ٹرین کی آمد کا انتظار شروع کر دیا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھوں کو تھپتھپایا۔میں نے مُڑ کر دیکھا تو میرا چھوٹا بیٹا تھا جو طبیعت تھوڑی سی خراب ہونے کی وجہ سے دفتر سے جلدی آگیا تھا۔اس کو ڈاکٹر سے فوری رجوع کرنے کی ہدایت کرنے کے باوجود مجھے اپنے بیٹے سے اس طرح کی اچانک ملاقات خوشگوار سی لگی۔اور پھر

عجیب سا معاملہ ہوا۔تب سے جب بھی میں فرینکفرٹ کی طرف جانے والی ٹرین کے لئے جاتا ہوں، فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو صرف اس وجہ سے دیکھتا ہوں کہ شاید میرا چھوٹا بیٹا پھر اس ٹرین سے اترے۔ایک بار سنیچر کا دن تھا۔آفس میں چھٹی کے باعث بیٹا گھر پر ہی تھا لیکن مجھے اپنے اولڈ ہوم میں معمول کے مطابق کام پر جانا تھا۔میں گھر کے دوسرے افراد کی طرح بیٹے سے بھی ہاتھ ملا کر اور خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلا۔لیکن شہر ہیڑس ہائم کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر جیسے ہی فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آئی،میں اس طرح اسے دیکھنے لگا جیسے ابھی اس میں سے میرا بیٹا اُترے گا۔پھر مجھے خیال آیا کہ بیٹا تو گھر پر ہے،میں کس کا انتظار کر رہا ہوں!اب بیٹے نے اپنی کار لے لی ہے اور وہ کار پر ہی آفس آتا جاتا ہے لیکن میں پھر بھی ہر بار فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو ایسے دیکھتا ہوں جیسے میرا چھوٹا بیٹا اس میں سے اترے گا اور میں اس سے ہونے والی ہلکی سی ملاقات کی خوشگواری کو محسوس کروں گا۔جاب پر جا کر سب سے پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کر کے پڑھ لیتا ہوں۔

پچھلے دنوں جرمنی کی سب سے زیادہ مالیت ۳۵ ملین یورو کی لاٹری کے بخار نے پورے جرمنی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔لاٹریوں کے چکر میں نہ پڑنے کے باوجود ۳۵ ملین اتنی بڑی رقم تھی کہ میں نے بھی اسے کھیلنے کا ارادہ کر لیا۔کچھ خاص دعائیں پڑھ کر حصہ لے لیا۔۳۵ ملین یورو کا مطلب ہے ساڑھے تین کروڑ یورو۔اور اس رقم کو پاکستانی مالیت میں تبدیل کیا جائے تو پونے تین ارب روپے بنتے ہیں۔

لاٹری کھیلنے کے بعد میں نے اس کا فیصلہ ہونے سے پہلے بہت سارے منصوبے بنا لئے تھے۔جرمنی میں ہی ایک بڑا رہائشی منصوبہ،جس میں میرے سارے بچے اپنے اپنے گھروں میں ایک ساتھ ہوں گے۔جرمنی میں ایک کمپنی کا قیام اور پاکستان اور انڈیا میں اس کمپنی کی طرف سے انویسٹمنٹ کے پروجیکٹس۔بچوں کے لئے ان کے ذہنی میلانات کے مطابق جرمنی میں مناسب کاروبار۔پاکستان میں اپنے پرانے گاؤں کے آس پاس ایک بڑی حویلی کی تعمیر۔پھر بہت سارے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے لئے بعض منصوبے،جن کے مطابق انہیں مالی امداد دینے کی

بجائے اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑا کرنے کے منصوبے شامل تھے۔اسی طرح بعض فلاحی
پروگرام شروع کرنے کے خاکے۔بہت ساری باتیں میرے ذہن میں آ گئی تھیں اور میں نے خود کو
ذہنی طور پر ان ساری ذمہ داریوں کے لئے تیار کر لیا تھا۔جس دن شام کو قرعہ اندازی ہونا تھی اس
دن میری معمول کی تلاوت کے دوران سورۃ انفال کی آیت انما اموالکم واولادکم فتنۃ نے مجھے ہلکا
سا جھٹکا لگایا۔یہ آیت آج کے دن ہی کیوں پڑھنے میں آئی اور پڑھتے وقت اتنی توجہ کیوں کھینچ
گئی؟۔لیکن پھر میں نے اسے ایک اتفاق سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔

قرعہ اندازی کا شفاف عمل ٹی وی پر میں نے اور میرے بیٹے نے براہِ راست ایک
ساتھ دیکھا۔میرا بیٹا کافی جذباتی ہو رہا تھا۔تب میں نے اسے سمجھایا کہ اگر انعام نکل آئے تو تب
بھی اپنی حیثیت سے باہر نہیں ہونا۔انعام نہیں نکلتا تو غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔دونوں
صورتوں میں خود کو نارمل رکھنا ہے۔قرعہ اندازی ہوئی تو ہمارا انعام نہیں نکلا۔۳۵ملین کا انعام کسی
اور کو مل گیا۔بیٹا میرے سمجھانے کے باوجود کافی افسردہ ہوا۔میں اسے تسلی دیتا رہا۔مجھے لاٹری کا بڑا
انعام حاصل نہ کر پانے کا افسوس نہیں تھا لیکن اپنے کئی منصوبوں کے ادھورے رہ جانے کی تھوڑی
سی حسرت دل میں ضرور ہونے لگی تھی۔انعام نکل آنے کی صورت میں اگلے دن میں نے اپنی
مزدوری والی جاب پر نہ جانے کا طے کر لیا تھا۔انعام نہیں نکلا تو اگلے دن میں معمول کے مطابق
اپنی جاب پر چلا گیا۔جاب سے واپسی پر روز کے معمولات سے گزرتا ہوا،رات کا کھانا کھا کر چند
منٹ کی سیر کے لئے نکلا۔

اپنے گھر کے قریب کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے عجیب سی روشنی محسوس
ہوئی،سٹریٹ لائٹس سے بالکل مختلف،جیسے مستقبل کے کسی دَور کی کوئی روشنی ہو۔اسی روشنی میں
یکاصیک ایک نوجوان دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔اس نے ایک بریف کیس مجھے تھماتے ہوئے کہا
اس میں ۳۵ملین یورو مالیت کے قیمتی ہیرے اور سونے کے بسکٹ ہیں۔پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی
ہے۔آپ اسے لے لیں،میری طرف سے آپ کے لئے تحفہ ہوا۔اور پھر وہ نوجوان آناً فاناً غائب
ہو گیا۔مجھے لگا جیسے میرے سارے منصوبے پورے کرنے کے لئے خدا نے کوئی آسمانی مدد بھیج دی

ہے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔
میرے دل کی دھڑکن ایک دَم تیز ہو گئی۔میں اپنی سیر کو ادھورا چھوڑ کر گھر کی طرف واپس پلٹا لیکن
ابھی میں اپنی بلڈنگ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ سائرن بجاتی ایک پولیس کار میرے قریب آ کر رُک
گئی۔پولیس والے مجھ سے اُسی نوجوان کی بابت پوچھ رہے تھے لیکن میرے جواب دینے سے
پہلے ہی اُن کی نظر میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس پر پڑ گئی۔تب مجھے بائبل کی ایک
آیت یاد آئی:

''ہم سونے کو آگ سے اور انسان کو سونے سے آزماتے ہیں''

پولیس مجھے گرفتار کر رہی تھی،اسی لمحے مستقبل کے کسی دَور جیسی عجیب سی روشنی غائب ہو گئی
اور میں نے سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے دوسری طرف پولیس نے ایک نوجوان کو
گرفتار کیا ہوا ہے۔اس کا بریف کیس پولیس کی تحویل میں ہے۔وہ نوجوان بالکل وہی تھا جو کچھ دیر
پہلے مجھے اپنا بریف کیس دے گیا تھا۔لیکن اب نہ تو میرے پاس کوئی بریف کیس تھا اور نہ ہی پولیس
نے مجھے کوئی ہتھکڑی لگائی ہوئی تھی۔تو پھر جو کچھ مجھ پر گزرا،یا میں نے محسوس کیا وہ سب کیا تھا؟ کیا
میں نے کوئی کشفی نظارہ سا دیکھا تھا یا کسی روشنی نے مجھے اپنے وقت سے چند منٹ پہلے کا سفر کرا کے
پھر واپس اپنے مقام پر چھوڑ دیا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔لیکن کچھ سمجھ آ بھی رہی تھی۔

کل رات والے نظارے یا تجربے کے بعد ساری رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آ سکی
تھی اور آج جب میں جاب پر جانے لگا ہوں تو طبیعت کافی بوجھل ہے۔گھر سے باہر نکلا تو گہرے
بادل اور دھند ایک دوسرے میں مدغم دکھائی دیئے۔ہیڑس ہائم ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو ریلوے
کے عملہ کی طرف سے اعلان ہو رہا تھا کہ ویزبادن سے فرینکفرٹ جانے والی ٹرین دس منٹ لیٹ
آ رہی ہے۔دھندلی فضا نے ریلوے اسٹیشن کی روشنیوں کو بھی مدھم کر رکھا ہے۔اس دوران فرینکفرٹ
سے آنے والی ٹرین اپنے ٹھیک وقت پر آ گئی اور میں اپنی عجیب سی عادت کے مطابق دیکھنے لگتا
ہوں کہ شاید میرا بیٹا اس میں سے اُتر کر آ رہا ہو۔فضا کی دھندلاہٹ کے باوجود واقعی میرا چھوٹا بیٹا
انجن کے ساتھ والے ڈبے سے نیچے اُترا ہے اور میری طرف آ رہا ہے۔میرے ہونٹوں پر ہلکی سی

مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔لیکن جیسے جیسے میرا بیٹا قریب آتا جارہا ہے،میری مسکراہٹ،حیرت آمیز ہوتی جارہی ہے۔کیونکہ اب وہ میرا بیٹا نہیں لگ رہا بلکہ صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ میرے ابا جی میری طرف آرہے ہیں۔میں ابا جی کا استقبال کرنے کے لئے ان کی طرف آگے بڑھ کر جاتا ہوں۔لیکن جب ان کے قریب پہنچتا ہوں تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔یہ تو میں خود ہوں!

میں اپنے آپ سے گلے مل رہا ہوں اور ایسے لگ رہا ہے کہ میں خود سے نہیں بلکہ اپنے سارے آباؤاجداد اور اپنی ساری موجودہ اور آنے والی نسلوں کو گلے مل رہا ہوں۔اسی حالت میں دیکھتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آرہی ہے۔دور سے اس کی ہیڈ لائٹ کی چمک اسٹیشن کی طرف بڑھتی چلی آرہی ہے۔

مجھے رات والا واقعہ یاد آجاتا ہے اور میں مزید کسی حیرت میں پڑے بغیر یقین کر لیتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی جو ٹرین کچھ دیر پہلے آچکی تھی،وہ دراصل اب آرہی ہے،ٹرین اسٹیشن پر رُک رہی ہے اور میں اس کے سب سے اگلے ڈبے میں سے اپنے اترنے کا انتظار کرنے لگتا ہوں!

☆☆☆

حیدر قریشی

وِگ

یہ بال و پر تو چلو آ گئے نئے حیدؔر
بلا سے پہلے سے وہ خال اور خد نہ رہے

جب سے میں نے ہوش سنبھالا تب سے ہی دیکھا کہ ابا جی کے سر پر بال نہیں تھے۔ بچپن سے ہی میری شدید خواہش رہی کہ ابا جی کے سر پر بال سجے ہوئے دیکھوں۔اس کی دو ممکنہ صورتیں تھیں یا تو کوئی ایسی دوا مل جائے جس سے بال دوبارہ اُگ آئیں یا پھر وِگ سجالی جائے۔ تب وگ خریدنے کے وسائل میسّر نہیں تھے پھر بھی میں نے ایک بار ابا جی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر رہ گئے۔اور بس!۔وسائل میسّر آنے سے پہلے ابا جی فوت ہو گئے۔ان کی وفات کے ساتھ ہی یہ انوکھا سا واقعہ رونما ہوا کہ دنیائے فانی سے کوچ کرنے کے بعد ابا جی میرے اندر آن بسے۔دل میں،لہو میں،روم روم میں بس گئے یہاں تک کہ میرے سر پر بھی پوری طرح نمودار ہو گئے۔تب مجھے اندازہ ہوا کہ واقعی ہمارا باہر بھی ہمارے اندر کا ایک حصہ ہے۔ابا جی کی محبت نے جب میرے اندر اور باہر پر پوری طرح غلبہ کر کے مجھے تصوف کے مقام فنائیت تک پہنچا دیا تب میں،میں نہ رہا۔میں نے آئینہ دیکھا تو ایسے لگا جیسے بیس برس پہلے کے ابا جی کو دیکھ رہا ہوں۔سر سے پاؤں تک وہی صورت۔پھر میں نے مقام فنا سے مقام بقا کا رُخ اختیار کرنے کا سوچا۔دراصل اب ہمہ وقت ابا جی سے ہی ملاقات ہوتی رہتی تھی اور اپنے آپ سے ملنے کی صورت

ہی نہیں بن رہی تھی۔ تب اپنے آپ سے ملنے کی خواہش نے جوش دکھایا:

چلو اپنی بھی جانب اب چلیں ہم
یہ رستہ دیر سے سُونا پڑا ہے

سو میں نے ایک مناسب سی وگ خریدی۔ اپنے مخصوص (مگر گمشدہ) ہیراسٹائل کے مطابق اسے برش کر کے سر پر سجالیا۔ وگ کا سر پر سجانا تھا کہ میکدے سے میری جوانی خود ہی اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ اپنی جانب کا ویران راستہ رونقوں سے بھر گیا۔ زندگی کا میلہ سا لگ گیا مجھے احساس ہوا کہ میں بیالیس برس کی عمر میں بلاوجہ باون برس کا بنا ہوا تھا۔ وگ کے بغیر میں اپنی عمر سے کہیں آگے نکل گیا تھا۔ وگ نے مجھے میری اصل عمر عطا کر دی۔ وگ پہن کے پہلے پہل آئنہ دیکھا تو ایسے لگا کہ کسی ایسے اجنبی مہمان سے مل رہا ہوں جس نے میرے گھر میں آ کر میرا ہی لباس زیب تن کر رکھا ہے لیکن ''خود کو پہچان'' والا فرمان یاد آیا تو اپنی معرفت کے مرحلے طے ہونے لگے۔ اپنے آپ سے ملاقات ہونے لگی۔

کسی سیلاب یا طوفان کے آنے کے بعد جب کوئی ہنستا بستا شہر ویران اور برباد ہو جاتا ہے تب باہمت اور جرأت مند لوگ اسے از سرِ نو آباد کر کے پہلے سے بھی خوبصورت بنا دیتے ہیں جبکہ کاہل اور نکمّے لوگ عرصہ دراز تک خیمے بنا کر گزارا کرتے ہیں۔ اسی طرح وقت کا بے رحم طوفان کئی انسانی سروں پر تباہی پھیلا کر ان کی اصل صورت کو بگاڑ دیتا ہے۔ وِگ نہ صرف اسی تباہی کا تدارک کرتی ہے بلکہ انسان کو اس کی اصلی صورت بھی عطا کر دیتی ہے۔ وِگ پہننے والے لوگ وہ باہمت اور جرأت مند لوگ ہیں جو وقت کی پھیلائی ہوئی تباہی سے پھر نئی تعمیر کرتے ہیں جبکہ ٹوپی پہن کر گزارہ کرنے والے لوگ خیموں میں پناہ لینے والوں جیسے ہیں۔

سیاہ رات اس دنیائے موجود کے سر پر ''زُلف دراز'' والی وگ ہے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے اس زُلف پر گرے ہوئے شبنمی موتی ہیں، کہکشاں اس کی مانگ میں بھری ہوئی افشاں ہے اور چاند ایک خوبصورت سنہری کلپ۔ یہ دنیائے موجود، رات بھر کسی محبوبۂ دلنواز کی طرح اپنی زلفوں کی مہک بکھیرتی ہے لیکن دن ہوتے ہی سورج کی تپش سے گھبرا کر اس وگ کو اُتار

کر رکھ دیتی ہے۔ وگ میں یہ سہولت ہے کہ آپ جب چاہیں وگ پہن کر اپنی اصل صورت دیکھ لیں اور جب چاہیں وگ کو اتار کر قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ کر لیں۔

ہرے بھرے کھیت، باغات اور جنگلات بہار کے موسم میں خوبصورت وِگیں پہن کر اپنی اصل صورت دکھاتے ہیں لیکن خزاں کسی حاسد کی طرح اُن وِگوں پر طنز کرتے ہوئے آتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے ان سب کی وِگیں اتارتی اور اُدھیڑتی چلی جاتی ہے۔ پھر ایک شیطانی قہقہہ لگا کر کہتی ہے: یہ باغات، جنگلات اور کھیت سب جھوٹ تھے۔ ان سب نے بھیس بدل کر انسانوں کو دھوکہ دیا تھا انہیں بہار کا غلام بنانے کی سازش کی تھی۔ اب اُن کا اصلی روپ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ تمام انسان اُن کا اصلی روپ دیکھ لیں اور بار بار جان لیں کہ یہ بہار ایک دھوکہ ہے۔ زندگی کی حقیقت فنا ہے۔ خزاں اسی سچائی کو پھیلانے کے لئے قدرت کی طرف سے مقرر کی گئی ہے۔ وقتی طور پر خزاں کی نحوست اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اسی دوران بہار پھر اپنے کھوئے ہوئے وقت کو واپس لانے کے لئے اندر ہی اندر کام کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی خزاں کی نحوست زائل ہونے لگتی ہے بہار پھر سارے کھیتوں، باغات اور جنگلات کے سروں پر ہریالی کی نئی وگیں سجا دیتی ہے۔ پھولوں کا مسکرانا، پرندوں کا چہچہانا، تتلیوں کا آنا بھنوروں کا منڈلانا۔ زندگی کا میلہ پھر سے لگ جاتا ہے۔

خزاں کے ہمنوا بعض دل جلے بھی وگ پہننے کو بھیس بدلنے یا بہروپ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن وگ پر بہروپ کا الزام بہتان ہے۔ یہ تو ایک ایسی سیدھی سادی سچائی ہے جو انسان کو اس کے اصل روپ میں پیش کرتی ہے۔ کوئی اس سچائی کو مانے نہ مانے یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس کے برعکس بہروپ تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر کے شیطان کو مہارت کے ساتھ چھپا کر باہر فرشتہ بنا پھرے۔ مایا لگی ہوئی پگڑی کا اکڑا ہوا طرّہ، تکبر کی ماری اکڑی ہوئی گردن، ریاکاری کی لمبی داڑھی اور نفیس جبّہ۔ یہ جبّہ و دستار بہروپ ہے۔ ایسے بہروپیوں کا یہ ساز و سامان اُتار لیا جائے تو نیچے سے ن۔م۔راشد کا لا=انسان برآمد ہوگا۔ جبّہ و دستار کا بہروپ تو خلقِ خدا کو گمراہ کرنے اور غلام بنانے کا ڈھونگ ہے جبکہ اس کے برعکس وِگ اس فکری آزادی کا اعلامیہ ہے جو غلامی سے نجات دلائے۔

وہ لیڈر بہروپیے ہیں جو عوام کی فلاح کے دعوے کرتے ہیں اور عملاً عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی بہروپیے ہیں جو مغربی ممالک میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لئے ایسے ایسے من گھڑت اور جھوٹے بیانات دیتے ہیں کہ گوئبلز کی روح بھی شرما جائے اور اپنے تمام جھوٹے بیانات کے باوجود سچائی کے علمبردار ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ ادب میں بھی ایسے کئی بہروپیے پائے جاتے ہیں۔ کسی مالدار ادیب سے دو لاکھ روپے کھا کر اسے ۲۵ ہزار روپے کا انعام دلانے والے، مناسب حق الخدمت کے طور پر کسی لولے لنگڑے افسانے کو دورِ حاضر کا ممتاز ترین افسانہ قرار دینے والے، کمپیوٹر کے عہد کی مناسبت سے کمپیوٹر کی قیمت پر مدح سرائی کرنے والے، ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر غریب مزدوروں اور کسانوں کی حمایت میں ادب لکھنے والے، اصل بہروپیے تو اس قماش کے لوگ ہیں جبکہ وِگ کیرلین پر اسیس کے بیان کردہ گم شدہ حصے کی دریافت میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ وِگ کا جہان بہروپیوں سے یکسر مختلف ہے۔ وِگ پر بہروپ کا الزام عائد کرنے والے حقیقتاً خود بہروپیے ہیں جو اپنے بہروپ کا بھرم قائم رکھنے کے لئے وِگ کی اہانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وِگ پہننا اپنے گم شدہ حصے کی بازیافت کا عمل ہے جس کے بغیر اپنی پہچان اور اپنے عرفان کے مرحلے طے نہیں ہو سکتے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد میں نے ایک بار پھر آئینے میں خود کو دیکھا تو مجھے ایسے لگا کہ ابا جی میرے سامنے کھڑے ہیں۔ اُن کے سر پر گھنے اور خوبصورت بال سجے ہوئے ہیں جنہیں سلیقے سے سیٹ کیا گیا ہے۔ اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میری بچپن کی وہ آرزو پوری ہو گئی ہے کہ کبھی ابا جی کے سر پر بھی بال سجے ہوئے دیکھ سکوں۔ تب ہی مجھ پر منکشف ہوا کہ ابا جی میرے اندر کی طرح باہر بھی اسی طرح موجود ہیں جیسے وِگ سے پہلے موجود تھے، اس فرق کے ساتھ کہ میں ان کی عمر کا جو زمانہ نہیں دیکھ سکا تھا اب مجھے وہ زمانہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔ میں آئینے میں ابا جی کو دیکھ کر مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔

انکشافِ ذات کا یہ نظارہ وِگ سے سرافراز ہوئے بغیر کہاں ممکن تھا!

☆☆☆

ایک مدت کے بعد میرے چھوٹے بیٹے ٹیپو کی ایک معصومیت نے میرے بچپن کی اُلجھن دور کر دی۔ میرے والد کی وفات پر ٹیپو کو معاملہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ دادا اَبو کو کیا ہو گیا ہے، جاگتے کیوں نہیں؟۔ جب اسے بتایا گیا کہ اب وہ کبھی نہیں جاگیں گے کیونکہ اللہ میاں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے تو دادا پوتے کی محبت کے جوش میں اس نے غصّے سے کہا: میں اللہ میاں کو مار دوں گا۔ اس پر اسے فوری طور پر سمجھانا پڑا کہ اللہ میاں کے بارے میں ایسی بات کہنا گناہ ہے کیونکہ وہ بہت بڑا ہے۔ اللہ میاں کی بڑائی کا سن کر ٹیپو نے پوچھا: کیا اللہ میاں دادا اَبو سے بھی بڑا ہے؟ جب اسے باور کرایا گیا کہ وہ سب سے بڑا ہے تب اس نے اس کی بڑائی کا کچھ اندازہ لگایا۔ شاید چشمِ تصوّر سے کچھ دیکھا۔ اپنے دونوں بازو کھولے اور انہیں پیچھے کی طرف جتنا لے جا سکتا تھا، لے جا کر پوچھا: کیا اللہ میاں اتنا بڑا ہے؟۔ اسی لمحے میں مجھے جیسے اپنے بچپن کی سوچ کا جواب مل گیا۔ ایک چھوٹا سا بچہ جس حد تک اپنے بازو پھیلا سکتا ہے اسی حد تک بڑائی کا سوچ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ بڑی شے اس کے نزدیک ہو ہی نہیں سکتی۔ تب ہی مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ خدا کے بارے میں مختلف عقائد رکھنے والے تمام مذاہب اور فرقے خدا کے معاملے میں ایسے معصوم اور سچے چھوٹے بچے ہیں جنہوں نے خدا کی عظمت، مقام اور بڑائی کو سمجھنے کے لئے اپنے اپنے ننھے منّے بازو پھیلا رکھے ہیں۔ جس کے بازو جہاں تک پھیل سکتے ہیں اس نے اسی حد تک خدا کو سمجھ رکھا ہے اور دوسروں کو بھی وہی خدا منوانے پر مُصر ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جب بھی جی چاہتا ہے میں چشمِ تصوّر سے اپنے بچپن اور لڑکپن کے دنوں کو اسی طرح ہنستا کھیلتا دیکھ لیتا ہوں۔ امی، ابو، بابا جی۔ جن بزرگوں اور عزیزوں کو فوت ہوئے زمانہ گزر گیا ہے انہیں بھی اُنہیں یادوں کے ساتھ اُسی حالت میں دیکھ لیتا ہوں۔ گویا چشمِ تصوّر پر نہ صرف زمان و مکان اثر انداز نہیں ہو پاتے بلکہ یہ ارواح کو بھی طلب کر سکتی ہے۔

انشائیہ ''چشمِ تصور'' سے دو اقتباس

☆☆☆

''کھٹی میٹھی یادیں'' کے مختلف ابواب میں

ابا جی/امی جی کا ذکر

جرمنی پہنچنے کے بعد بچپن میں امّی جی سے سنی ہوئی کئی کہانیاں یاد آئیں۔مبارکہ جس کی سادگی کا میں پاکستان میں مذاق اڑایا کرتا تھا، جرمنی میں اب اس کے سامنے میں ایک پاکستانی ''پینڈو'' تھا۔مبارکہ بچوں سمیت مجھ سے اڑھائی سال پہلے جرمنی میں آ چکی تھی اس لئے یہ ملک اس کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا جبکہ میں ''کثرتِ نظّارہ'' سے ایسے رُک رُک جاتا تھا جیسے شہر کے چوراہے پر ''گواچی گاں'' کھڑی ہوتی ہے۔پہلی بار ایک مارکیٹ میں داخل ہونا تھا۔میں دروازے کے قریب پہنچا تو آٹومیٹک دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔امی جی سے سنی ہوئی ''علی بابا اور چالیس چور'' والی کہانی یاد آ گئی۔اُس کہانی میں ''کھل جا سم سم'' کہنے سے دروازہ کھلتا تھا۔یہاں تو مجھے ''کھل جا سم سم'' کہنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔زمین دوز ریلوے اسٹیشنوں میں، مارکیٹوں میں، اُوپر نیچے آنے جانے کے لئے خودکار سیڑھیاں لگی ہوئی ہیں۔میں نے پہلی بار جھجک کے ساتھ بجلی کی سیڑھی پر قدم رکھا، ہلکا سا چکر آیا۔میں نے لحظہ بھر کے لئے آنکھیں موندلیں، جیسے ہی آنکھیں کھولیں، اُوپر کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔کسی اناڑی کی طرح سیڑھی کی حد سے باہر آیا تو امی جی کی سنائی ہوئی کئی کہانیاں یاد آنے لگیں۔کہیں کوئی نیک دل دیو ہے، کہیں سبز پری اور کہیں کوئی درویش ہے جو مہم جُو شہزادے کو کسی لمبی مسافت کی کوفت سے بچانے کے لئے، اس کی مدد کرتے ہوئے اُسے آنکھیں مُوندنے کے لئے کہتے ہیں،

پھر جب شہزادہ آنکھیں کھولتا ہے تو منزلِ مقصود پر پہنچا ہوتا ہے۔میں اُوپری منزل پر پہنچا تو میرے ساتھ نہ کوئی نیک دل دیو تھا، نہ کوئی درویش اور نہ ہی کوئی سبز پری۔۔۔۔صرف مبارکہ میرے ساتھ تھی۔اس نے اگر سبز سوٹ پہنا بھی ہوا تھا تو وہ اس کے برقعہ کے کوٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔اس کے باوجود میں نے مبارکہ کو من ہی من میں سبز پری سمجھا اور خود کو شہزادہ گلفام سمجھ کر خوش ہولیا۔

یہاں کے گھروں میں کھڑکیوں کا شیشہ ایسا ہے کہ آپ اندر بیٹھے ہوئے باہر کی ہر چیز کو دیکھ سکتے ہیں جبکہ باہر کھڑا ہوا کوئی آدمی آپ کو بالکل نہیں دیکھ سکتا۔جب مجھے پہلے پہل اس کا علم ہوا دھیان فوراً سلیمانی ٹوپی والی کہانی کی طرف چلا گیا۔مجھے ایسے لگنے لگا جیسے میں امی جی کی سُنائی ہوئی ڈھیر ساری کہانیوں کا جیتا جاگتا کردار بن گیا ہوں۔ساری کہانیاں جیسے اپنے آپ کو میرے وجود میں دُہرانے لگی ہیں۔کاش! امی جی زندہ ہوتیں اور میں انہیں اُن کی سنائی ہوئی کہانیوں کا حقیقی رُوپ دکھا سکتا۔اب تو وہ خود ہی کہانی بن گئی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خانپور میں شوگر ملز کی ملازمت کے دوران ایک دفعہ میری شام ۶ بجے سے رات ۲ بجے تک والی شفٹ تھی۔گھر سے چلا تو ہلکے سے ٹمپریچر کا احساس ہو رہا تھا، فیکٹری پہنچنے تک بخار ہو گیا۔میں نے ساتھیوں کو اپنا کام سونپا اور خود لیبارٹری کے ڈارک رُوم میں جا کر لیٹ گیا۔فرش پر فلٹر کلاتھ کا ایک ٹکڑا بچھا ہوا تھا، ایک اینٹ کا تکیہ بنا لیا لیکن اُوپر لینے کے لئے کوئی کپڑا نہیں تھا۔بخار کی وجہ سے ٹھنڈ بھی لگ رہی تھی۔میں اپنے آپ میں سمٹ کر ٹھنڈ سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔اسی دوران بخار کی غنودگی کی حالت میں ایسے لگا جیسے کسی نے آ کر گرم رضائی میرے اُوپر ڈال دی ہو۔کسی کے آنے، اپنے اُوپر رضائی ڈالے جانے اور پھر اس رضائی کو اپنے دائیں، بائیں اچھی طرح لپیٹنے کا عمل مجھے صاف صاف محسوس ہوا تھا۔پھر مجھے گہری نیند آ گئی۔رضائی کی گرمائش سے کھل کر پسینہ آیا۔

چھٹی کے پہلے سائرن کے ساتھ میری آنکھ کھلی تو مجھے محسوس ہوا بخار اُتر چکا ہے۔میں نے رضائی کو اپنے اُوپر سے ہٹا کر اُٹھنا چاہا۔لیکن میرے اُوپر تو کوئی رضائی نہیں تھی۔پھر یہ سب کیا تھا؟۔۔۔۔میں نے ابا جی کو یہ بات بتائی تو انہوں نے کہا ایسے واقعات کو کسی کے آگے بیان نہیں کرنا چاہئے ورنہ انسان ایسے تجربات کی لذّت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔(ابا جی کی وفات کے بعد

ابا جی کے تعلق سے ایک تجربے کے بعد مجھے بابا جی نے بھی ایسی ہی نصیحت کی تھی۔لیکن شاید مجھ میں اخفاء کی برداشت کی قوت نہیں ہے)۔

(باب ''بزمِ جاں'' سے اقتباس)

میرے ددھیال میں ابا جی اور بابا جی صرف دو ہی بھائی تھے' بہن کوئی نہ تھی' سو ہماری کوئی پھوپھی نہ تھیں۔تاہم ابا جی اور بابا جی کی دو کزنز تھیں۔بُوا حیات خاتوں اور بُوا لال خاتوں۔ دونوں سے ہمیں پھوپھیوں کا اتنا پیار ملا کہ کسی حد تک پھوپھیوں کی عدم موجودگی کی تلافی ہوگئی۔ بُوا حیات خاتوں چاچڑاں شریف میں بیاہی ہوئی تھیں۔ہمارے رحیم یار خاں میں قیام کے دوران' اور پھر خانپور میں قیام کے دوران بھی ان کا ہمارے ہاں مسلسل آنا جانا رہا۔ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔مجھے امی جی کے بعد بچپن میں سب سے زیادہ کہانیاں بُوا حیات خاتوں نے سُنائیں۔۔۔۔ کوٹ شہباز کے اہلِ قریش رحیم یار خاں جب بھی آتے' ہمارے ہاں قیام کرتے۔خانپور میں بھی ہمارا گھر ان کے قیام کا مرکز رہا۔رحیم یار خاں میں رہائش کے دنوں کی بات ہے میرا چھوٹا بھائی اکبر (جو اَب لندن میں مقیم ہے) گھر کے صحن میں بیٹھا مٹی سے کھیل رہا تھا۔تب اس کی عمر چار سال کے لگ بھگ تھی۔کھیلتے کھیلتے اچانک چونک کر بولا: ''اوہ!'' امی جی اس کی طرف متوجہ ہوئیں تو کہنے لگا: کوٹ شہباز والے آرہے ہیں۔۔۔امی جی نے خیال کیا کہ بچے کو بعض عزیزوں کا خیال آگیا ہوگا اس لئے ایسی بات کردی ہے۔کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد اکبر نے پھر ویسی ہی ''اوہ!'' کی اور پھر بتانے لگا: ان کی جیپ خراب ہوگئی ہے۔امی جی تو ابا جی کی بزرگی اور روحانیت سے بھی الجھتی رہتی تھیں' کچھ کچھ معاملہ بھانپ گئیں اور کہنے لگیں: بڑے میاں سو بڑے میاں' چھوٹے میاں سبحان اللہ۔۔۔ابھی ان کے باپ کی بزرگی مانی نہیں گئی اور یہ بیٹا بھی بزرگی جتانے لگا ہے۔تھوڑے وقفہ کے بعد اکبر نے پھر ''اوہ'' کی اور کہا: جیپ ٹھیک ہوگئی ہے۔اب وہ ہمارے گھر آرہے ہیں۔۔۔اور پھر سچ مچ تھوڑی دیر کے بعد کوٹ شہباز والے آگئے۔امی جی نے ان کے آتے ہی پوچھا: کیا آپ لوگوں کی جیپ رستے میں خراب ہوگئی تھی؟۔۔۔وہ سب

کے سب ہکا بکا رہ گئے کہ یہ خبر ہمارے گھر کیسے پہنچ گئی۔اکبر جو اپنے آپ میں مگن بدستور مٹی سے کھیل رہا تھا' امی جی نے اس کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ ہمیں تو ساری رپورٹ یہی دیتا رہا ہے۔۔۔۔۔۔بوالال خاتوں کے بعد بھی کوٹ شہباز کے عزیزوں سے پیار محبت کا تعلق قائم رہا۔ یہ تعلق ختم تو نہیں ہوا لیکن اس میں تھوڑی سی دراڑ ضرور پیدا ہوگئی۔ہم لوگ قریشی ہونے کے باوجود ذات پات کو اہمیت نہیں دیتے۔میری والدہ باجوہ خاندان سے ہیں۔میری بیوی بھی باجوی ہے کہ میری ماموں زاد ہے۔رشتے ناطے میں ہم صرف ''موزوں رشتے'' کو اہمیت دیتے ہیں۔میری ایک بھابی جٹ خاندان کی ہے' ایک ارائیں اور ایک اعوان۔ایک بہنوئی سید ہے' ایک راجپوت ہے اور دو جٹ۔۔۔میری بڑی بہن کی شادی ہوئی۔کوٹ شہباز والے عزیز بڑے چاؤ سے شریک ہوئے۔شادی سے پہلے آکر رونق لگائی۔رخصتی والے دن جب بارات آئی تو انہوں نے دیکھا کہ بارات میں اونچے اونچے طرّوں والے پنجابی جٹ موجود ہیں۔اِدھر اُدھر سے سن گن لی۔ جیسے ہی انہیں پتہ چلا کہ دولہا کا نام چودھری عبدالرّحیم ہے اور قریشیوں کی بیٹی کا بیاہ ایک جٹ سے ہورہا ہے' اُن کی قریشی شان کو دھچکا سا لگا۔خاموشی سے ایک بس بُک کرا کے لائے اور تمام مرد' خواتین اور بچے بس میں بیٹھ کر اپنے گاؤں چلے گئے۔شادی کے ہنگامے میں ہمیں پتہ بھی نہ چل سکا۔ وہ تو جب رخصتی کا وقت آیا اور اُن میں سے بعض عزیزوں کو آگے لانے کی ضرورت پڑی' تب پتہ چلا کہ وہ تو سب کے سب خاموش احتجاج کرتے ہوئے جا چکے ہیں۔تب ابا جی کو اپنے ان عزیزوں پر افسوس ہوا۔ان سے ملنا ملانا تو ترک نہیں کیا لیکن انہیں پھر کسی بچے کی شادی پر مدعو نہیں کیا۔۔۔۔۔۔کوٹ شہباز میں تو صرف وٹے سٹے کا رواج تھا جبکہ باقی سرائیکی علاقے میں وٹے سٹے کا متبادل ٹکا کہلاتا ہے۔یعنی اگر رشتہ کے بدلے میں رشتہ نہیں ہے تو ایک معقول رقم ادا کرکے لڑکی کا رشتہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔وٹہ سٹہ میں ایسے بھی ہوا کہ باپ نے اپنی بیٹی بیاہی اور اس کے بدلہ میں دولہا والوں کی بہن سے اپنی دوسری شادی رچالی۔ایسا مفاہمانہ رویّہ بھی دیکھنے میں آیا کہ لڑکی بیاہتے وقت فریق ثانی کے پاس وٹہ نہیں تھا تو اس نے اپنے ہاں ہونے والی پہلی بیٹی وٹہ میں لکھ دی۔اسے ''پیٹ لکھوا لینا'' کہا جاتا ہے۔ٹکے والی شادی میں صرف رقم بھی چلتی

ہے اور رقم کے ساتھ دوسری چیزیں بھی۔۔۔۔۔۔مثلاً ایک بکری' دو مُرغیاں' ایک سیکنڈ ہینڈ سائیکل
اور ۵۰۰ روپے دے کر لڑکی کا رشتہ حاصل کیا گیا۔تاہم قریشیوں میں صرف وٹہ سٹہ ہی کا رواج تھا'
وہ بھی صرف قریشیوں کے ساتھ۔امی جی پنجابی تھیں۔ان کے خاندان میں وٹہ سٹہ جیسی کوئی قبیح رسم
رائج نہیں تھی۔ابا جی سے ان کی شادی ہوئی۔پہلی دفعہ سرائیکی ماحول میں آئیں۔پندرہ برس کی
عمر۔۔۔اتنی خوبصورت لڑکی۔۔۔۔دلہن کو دیکھنے کے لئے آنے والیاں پوچھتیں:

بہن! وٹہ تو قریشیوں کا تھا نہیں۔۔۔پھر ٹکا دیا ہوگا؟

کوئی رشتہ دار خاتون جو امی جی کا خیال رکھنے کے لئے موجود ہوتیں' جواب دیتیں:

نہیں بہن ٹکا نہیں لیا' اللہ واسطے دی ہے۔

جب دس بارہ خواتین نے یہی بات کی اور ہر بار یہی وضاحت کی گئی تو امی جی نے رونا
شروع کر دیا۔تب ابا جی نے انہیں سمجھایا کہ علم کی کمی کے باعث ہمارے علاقے میں بہت ساری
غیر اخلاقی اور غیر اسلامی رسمیں رائج ہیں۔آپ ایسی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں کہ ہماری شادی تو
درست اسلامی طریق سے ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ویسے کوٹ شہباز کے قریشیوں میں بھی اب
بیٹیوں کے رشتے کی اہمیت واضح ہونے لگی ہے۔رشتے تو بے شک قریبی رشتہ داروں میں کئے
ہیں لیکن اب وٹے سٹے کے بغیر بھی رشتے کرنے لگے ہیں۔

(باب ''ددھیال کے رشتہ دار'' سے اقتباس)

عام طور پر ہر انسان کی پہلی درسگاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔میری پہلی درسگاہ بھی میری
ماں کی گود تھی۔اور دوسرا اسکول ابا جی کی خصوصی توجہ تھی۔جب ابا جی کی رحیم یار خان میں کپڑے کی
دوکان تھی مجھے دوکان پر بلوا لیا کرتے تھے اور اردو لکھنا پڑھنا سکھایا کرتے تھے۔جب کوئی فاش قسم
کی غلطی ہوتی' مجھے ایک تھپڑ پڑتا۔میں رونے لگتا تو ابا جی پھر پیار کرنے لگتے۔پیسے دیتے۔۔پیسے
ملنے پر میں بھاگ کر جاتا اور بازار کی قریبی دوکان سے کھانے کی کوئی چیز لے آتا۔جب تک وہ
چیز کھاتا رہتا' میری چھٹی رہتی۔چیز ختم ہوجاتی تو پھر پڑھائی شروع ہوجاتی۔یوں دن میں لگ

بھگ چار پانچ دفعہ سبق بھولتا' تھپڑ کھاتا' پیار پاتا اور پھر چنے' مرونڈا' میٹھی گولیاں' کھانے وغیرہ
کھاتا۔سبق بھولنے میں تھوڑا سا نقصان تھا مگر بہت سارا فائدہ بھی تھا۔اب سوچتا ہوں تو ابا جی
کے تھپڑوں والا ''نقصان'' ہی مجھے سب سے بڑا فائدہ اور اپنا اثاثہ لگتا ہے۔

ابا جی کی اس توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اسکول میں داخل ہونے سے پہلے اخبار پڑھنے لگ
گیا تھا۔جب مجھے اسکول میں داخلے کے لئے لے جایا گیا تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر راجہ محبوب
صاحب نے میرا ٹیسٹ لیا اور مجھے کچی' پکّی کلاسوں کی بجائے سیدھا دوسری جماعت میں داخل
کر لیا گیا۔پرائمری لیول پر میری پڑھائی کے سلسلے کی یہی ایک اہم بات تھی۔

(باب ''پڑھنے سے پڑھانے تک'' سے اقتباس)

اپنی زبان میں دعاؤں کا میرا سلسلہ اُس وقت متزلزل ہونے لگا جب میں نے ۱۹۸۶ء
میں اپنے ابا جی اور امی جی کی لمبی عمر کی دعائیں مانگنا شروع کیں اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے
میرے دونوں بزرگ دنیا سے چل بسے۔پھر میں نے اپنے بابا جی (تایا جی) کے لئے یہی دعا کی
اور وہ بھی فوت ہو گئے۔تب میں جو بھی دعا کرتا اُس کی تاثیر اُلٹ ہو جاتی ؎

جو دعا کرتے تھے اُلٹا ہی اثر ہوتا تھا
تیری چاہت کی دعا رب سے بچا لی ہم نے

(باب ''دعائیں اور قسمت'' سے اقتباس)

رحیم یار خاں میں ہمارے قیام کے زمانے میں ایک بار میرے ننھال سے بے جی' خالہ
حبیبہ' ماموں سمیع' ماموں صادق' ماموں کوثر' ماموں ناصر۔۔۔بہت سارے عزیز آئے ہوئے
تھے۔تب ابا جی اور چاروں ماموؤں نے ایک تفریحی گراؤنڈ میں دوڑ کا مقابلہ کیا۔یہ مقابلہ ابا جی
نے جیت لیا تھا۔۔۔۔۔۔بات ہو رہی تھی ابا جی اور ماموؤں کی ریس کی۔ایک اور موقعہ پر ابا جی'
ماموں کوثر' ماموں صادق' ماموں سمیع اور محلے کے بہت سارے احباب شامل ہوئے۔فٹ بال میچ

کھیلا گیا۔بچوں کو بھی ٹیموں میں شامل کیا گیا۔میں ابا جی کی ٹیم میں تھا۔مجھے ابھی کھیلنا تو آتا نہیں آتا تھا'پھر بڑوں کے سامنے ویسے بھی کیا کھیل پاتا۔اس کے باوجود ابا جی باآواز بلند''شاباش۔۔۔حیدر شاباش۔۔۔'' کہہ کر میری ہمت بندھاتے رہے۔کک وہ خود مارتے اور مجھے شاباش دیتے جاتے۔اسی دوران مجھے پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔میں گراؤنڈ سے باہر کسی مناسب جگہ پر پیشاب کررہا تھا۔تب بھی ابا جی کی آواز آئی:''شاباش۔۔حیدر شاباش''یہ ایسی سچویشن تھی کہ دونوں ٹیمیں دیر تک ہنستی رہیں۔

(باب''شوخیاں،بچپنا'' سے اقتباس)

میں مزاجاً کنجوس نہیں ہوں لیکن اپنی ذات پر خرچ کرنے کے معاملے میں ہمیشہ سے کنجوس ہوں۔مجھے اچھی طرح سے یاد ہے ایف اے کا امتحان دینے کے لئے مجھے خانپور سے رحیم یار خاں جانا تھا۔ابا جی مجھے خود لے کر رحیم یار خاں گئے۔وہاں انہوں نے مجھے تھوڑی سی رقم دی کہ امتحان کے بعد کچھ کھا پی لینا۔مجھے امتحان گاہ تک چھوڑ کر ابا جی خانپور واپس چلے گئے۔امتحان کے بعد میں نے دو آنے کے چنے بھنوائے اور باقی ساری رقم لا کر ابا جی کو دے دی۔۔۔۔۔۔۔
میری امی جی نے گھر کے کام کاج میں مَردوں کو زحمت نہیں دی۔ابا جی ہوں'یا بابا جی'میں یا میرے چھوٹے بھائی'ہم میں سے کسی نے گھر کے اندر کے کام کاج نہیں کئے۔مثلاً کپڑے یا برتن دھونا'چارپائیاں اُٹھانا'بستر بچھانا'کھانا پکانا وغیرہ۔۔۔۔۔۔اس قسم کی عادتوں کو بیماریوں میں شمار کرنا چاہئے کہ ایسی عادت علّت کے زمرہ میں آتی ہے اور علّت وعلالت کا قرب ظاہر ہے۔
مجھے بیشتر عادتیں اور بیماریاں والدین سے ملی ہیں۔میرے ننھیال میں شوگر کی بیماری موروثی ہے۔
امی جی کو بھی شوگر کی شکایت تھی اور اسی وجہ سے ان کی وفات ہوئی۔سو مجھے شوگر کی شکایت ہے۔
اسی طرح ابا جی کو بواسیر کی شکایت تھی۔ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف بھی تھی۔مجھے یہ دونوں بیماریاں بھی ایک عرصہ سے لاحق ہیں۔بس اتنا ہے کہ ابا جی کے مقابلہ میں مجھے ایسے وسائل میّسر ہیں کہ میں آسانی سے انہیں کنٹرول کئے رکھتا ہوں۔''پرہیز علاج سے بہتر ہے''پر ممکنہ حد تک عمل کرنے کی

کوشش کرتا ہوں۔کبھی کبھی بد پرہیزی بھی ہو جاتی ہے۔ویسے جرمنی آنے کے بعد بلڈ پریشر بالکل نارمل ہو گیا ہے۔اس کے باوجود وقتاً فوقتاً چیک کرتا رہتا ہوں۔بواسیر کی جڑیں ختم تو نہیں ہوئیں لیکن یہ بیماری بھی اس حد تک کنٹرول میں آ گئی ہے کہ گویا ہے ہی نہیں۔اسے خدا کا فضل کہنا چاہئے کہ بیماری ہوتے ہوئے بھی''نہ ہونے''جیسی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۷۳ء میں خانپور میں قیامت خیز سیلاب آیا تھا۔تب ہمارا مکان اس سیلاب کی نذر ہو گیا تھا۔مشرقی جانب کمرے کی دیوار گر چکی تھی۔خیال تھا کہ اس طرف نئی دیوار اُٹھا کر کام چلا لیں گے۔لیکن باقی دیواروں کی حالت بھی سیلاب کی مار سے کچھ مخدوش سی لگتی تھی۔اسی دوران بابا جی ایک کمرے اور برآمدے کے درمیانی دروازے کو اینٹ مار کر نکالنے لگے۔تب بابا جی کمرے کی طرف تھے۔ابا جی اور میں برآمدے کی طرف تھے۔برآمدے کی مشرقی سائڈ والی دیوار سلامت تھی۔جبکہ کمرے کی مشرقی سائڈ والی دیوار گر چکی تھی۔میں دروازے کے قریب تھا۔۔۔۔ابا جی تھوڑا سا پیچھے تھے اور بابا جی کو روک رہے تھے کہ غلام حسین !ایسے مت کرنا۔لیکن بابا جی نے اسی دوران ہی اینٹ سے دروازے کے اوپری حصّہ پر ضرب لگا دی۔ایک دھماکہ سا ہوا۔میں پیچھے پلٹا تو ابا جی کو باہر جمپ کرتے دیکھا۔بابا جی کے بارے میں مجھے ایسے لگا جیسے وہ اندر ملبے کے نیچے آ گئے ہوں۔ابا جی نے بعد میں بتایا کہ بابا جی نے تو مشرقی جانب چھلانگ لگا لی تھی۔ابا جی کو ایک بار تو ایسے لگا کہ بیٹا گیا۔دل میں انا للہ بھی پڑھ لیا۔پھر انہوں نے مجھے آواز دی تو میں نے ملبے میں سے کہا کہ میں تو ٹھیک ہوں'بابا جی کا پتہ کریں۔تب ابا جی کو تھوڑی سی تسلی ہوئی۔انہوں نے وہیں سے بتایا کہ بابا جی بھی خیر سے ہیں۔یہ سب کچھ کیسے ہوا؟اس کا تو کچھ پتہ نہیں'لیکن صورتحال یہ تھی کہ برآمدے کی چھت کے ساتھ ساتھ'اس سے منسلکہ کمرے کا بیشتر ملبہ بھی مجھ پر آن گرا تھا۔لیکن ایسے طریقے سے کہ شہتیروں نے ایک دوسرے کو ٹیک دے کر اوپر آئی ہوئی کڑیوں کو روک رکھا تھا۔جب سارا ملبہ ہٹا کر مجھے باہر نکالا گیا تو میں خود چل کر ساتھ والے ہمسائے چاچا بگو کے گھر تک گیا۔میں کہہ رہا تھا میں بالکل ٹھیک ہوں۔لیکن بابا جی کا کہنا تھا کہ ابھی جسم گرم ہے اس لئے ایسا لگ رہا ہے۔ابا جی مجھے چارپائی پر لیٹنے کو کہہ رہے تھے۔جب میں چارپائی پر بیٹھا تو اندر کی ضربوں نے اپنے

''ہونے'' کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ تب مجھ پر گھبراہٹ سی طاری ہوئی۔ اسی دوران دودھ اور دیسی گھی کو ملا کر گرم کر چکے تھے۔ اسے پینے سے کچھ بہتر محسوس ہوا۔ بعد میں ہسپتال بھی گئے لیکن دودھ اور دیسی گھی والا نسخہ زیادہ کارگر رہا۔۔۔۔۔۔ مجھے اونچائی سے اور دریا' یا سمندر کے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ حالانکہ پانی زندگی کی بنیاد ہے اور بلندیوں کے حصول کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ پہاڑ کی چوٹی تو دور کی بات ہے' مجھے دس بارہ منزلہ عمارتوں سے نیچے جھانکتے ہوئے بھی وحشت ہوتی ہے۔ دراصل میں بچپن سے بہت ڈرپوک ہوں۔ ''اندھیرے کی ماں'' سے ایک عرصہ تک بہت ڈر لگتا رہا۔ امی' ابو مجھے کسی شرارت سے روکنے کے لئے عموماً آخری حربے کے طور پر ''اندھیرے کی ماں آ جائے گی'' کہہ کر ڈراتے اور میں شرارت سے باز آ جاتا۔ یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا کہ ''اندھیرے کی ماں'' تو بڑی کام کی چیز ہے۔ انسان کی پردہ پوشی جیسا نیک کام کرتی ہے۔

دوپہر کے وقت بھی اگر کبھی امی مجھے کہتیں کہ گھر کی چھت پر پڑی کوئی چیز لے آؤ تو میں بھری دوپہر میں بھی چھت پر جاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ کسی چھوٹے بھائی کو ساتھ لے لیتا۔ گھر پر کوئی اور نہ ہوتا تو ڈرتے ڈرتے چھت پر جاتا اور وہاں سے آواز دیتا رہتا۔

''امی! چھاج نہیں مل رہا۔ کس طرف ہے؟۔۔۔۔۔۔۔''

امی جی وہیں سے ہنس کر آواز دیتیں:

''تُو بھی میری طرح ڈرپوک ہے۔ دھیان سے دیکھ چھت پر ہی ہے''

اور میں جیسے تیسے چھاج (یا جو کچھ بھی منگایا جاتا) لے کر چھت کی سیڑھیوں سے جلدی جلدی اترنے لگتا اور اترتے اترتے بھی کوئی نہ کوئی بات کرتا جاتا۔

(باب ''علتیں، علالتیں'' سے اقتباس)

میری بالکل ابتدائی ادبی تربیت میں میرے خاندان کے تین اہم افراد کا لاشعوری عمل دخل رہا۔ ان کا میں اپنی بعض تحریروں میں ہلکا سا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ ابا جی نے مجھے اسکول جانے سے پہلے جس طرح اردو پڑھنا، لکھنا سکھا دیا تھا وہ میری ادبی تربیت کا پہلا زینہ تھا۔ پھر امی جی کا

گھر میں دلچسپی لے کر ناول پڑھنا بھی مجھے ادب کے ساتھ جوڑنے کا ایک سبب بنا۔ امی جی نے ایک بار ایک طویل دعائیہ پنجابی نظم لکھی تھی۔ پھر میرے بچپن ہی میں ماموں حبیب اللہ صادق کا شاعر ہونا۔ میں سمجھتا ہوں میرے بچپن کے یہ سارے عوامل میری ادبی تربیت کا سبب بنتے رہے ہیں۔

(باب ''ابتدائی ادبی زمانہ'' سے اقتباس)

میں نے ''مائے نی میں کنوں آکھاں'' کے عنوان سے اپنی امی جی کا خاکہ لکھا۔ اس کے بعد جیسے والدہ کے بارے میں لکھنے والوں کی بہار آ گئی۔ بعض دوستوں نے اپنی اپنی والدہ کے حوالے سے پوری کتابیں لکھ دیں۔ اگرچہ ایسی کتابوں میں طوالت کے باعث جذباتیت زیادہ راہ پا گئی ہے تاہم ایک مثبت رویے کی طرف لکھنے والے دھیان تو دینے لگے، یہی بڑی بات ہے۔ اپنی والدہ کے علاوہ میں نے اپنی بڑی بہن کا خاکہ ''محبت کی نمناک خوشبو'' اور اپنی اہلیہ کا خاکہ ''پسلی کی ٹیڑھ'' لکھا جنہیں ادبی دنیا میں کافی پسند کیا گیا۔ مجموعی طور پر میرے خاکوں اور یادوں میں ماں، دادی، نانی، بہن، بیٹی، ممانی، کے کردار براہ راست آئے ہوئے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی امی جی کے اثرات سے خود کو کبھی بھی آزاد نہیں کر سکتا بلکہ ان کے اثرات سے آزاد ہونا ہی نہیں چاہتا۔

(باب ''ادبی کائنات میں رنگ'' سے اقتباس)

ہم لوگ ۳۰ میل فی گھنٹہ سے زندگی شروع کرنے والے ۵۰ کلو میٹر فی گھنٹہ تک ہی پاکستان میں خوش ہو جاتے تھے۔ کسی عزیز کو الوداع کہنے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر جاتے یا کوئی ہمیں الوداع کہنے آتا، گاڑی ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رینگنا شروع کرتی تو الوداع کہنے والے چلتی ٹرین کے ساتھ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلتے اور الوداع کہنے کا یہ ایک ڈیڑھ منٹ کا وقت جیسے ملنے اور بچھڑنے کے سارے زمانے ساتھ لئے ہوتا تھا۔ ابا جی کبھی ہمیں ٹرین پر سوار کرنے آتے تو عموماً پلیٹ فارم کے آخری سرے تک ساتھ ساتھ چلتے آتے۔ اور جب پلیٹ فارم اور ابا جی ایک ساتھ

آنکھ سے اوجھل ہوجاتے تو اگلی منزل پر جانے کی خوشی کے باوجود ایسے لگتا جیسے ابا جی گم ہو گئے ہیں۔اوراب کہ زندگی کی اس منزل پرآ گیا ہوں جہاں لوکل ٹرین بھی سٹارٹ ہوتی ہے تو اتنی رفتار پکڑ لیتی ہے کہ ایک قدم بھی ساتھ ساتھ چلنے کی نوبت نہیں آنے دیتی۔یہاں ایک بار بچوں کو ٹرین کے ذریعے سفر کر کے ہمبرگ جانا تھا،میں انہیں خدا حافظ کہنے کے لئے ریلوے اسٹیشن تک ساتھ گیا۔جب ٹرین روانہ ہوئی تو میں بچوں کو ٹرین کے ساتھ چلتے چلتے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہنے کی خواہش دل میں ہی لئے رہ گیا۔لیکن اس تجربہ نے مجھے فرینکفرٹ ریلوے اسٹیشن پر ابا جی سے ملا دیا۔ مجھے لگا ابا جی عدم کے پلیٹ فارم پر کھڑے مجھے زندگی کی ٹرین میں دیکھ کر ہاتھ ہلاتے،ساتھ ساتھ چلے آرہے ہیں۔

(باب ''رہے نام اللہ کا'' سے اقتباس)

معمولاتِ زندگی میں احتیاط اچھی چیز ہے لیکن بہت زیادہ احتیاط سے بھی خرابی ہوجاتی ہے۔اپنے گھر کی دومثالیں یاد آ گئیں۔پاکستان میں کھانا کھاتے ہوئے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سالن میرے کپڑوں پر گر جاتا تھا۔یہ عادت یہاں بھی قائم ہے۔جتنی زیادہ احتیاط کروں کہ سالن نہ گرے اتنا ہی زیادہ ایسا ہوجاتا ہے۔یوں بیوی کی کڑوی کسیلی سننا پڑتی ہیں۔میری چھوٹی بہن زبیدہ خانپور کے زمانہ میں جب گھر کے برتن دھو رہی ہوتی تو آواز سے پتہ چلتا کہ کوئی گلاس ٹوٹ گیا یا پلیٹ ٹوٹ گئی ہے۔نقصان پر امی جی تھوڑا سا بولتیں تو ابا جی ہنستے ہوئے کہتے کہ بیٹا ایک اور گلاس بھی توڑ دو۔اور اسی وقت دوسرا گلاس ٹوٹنے کی آواز آجاتی۔ایک بار اسی طرح جب دوسرا گلاس ٹوٹنے کی بھی آواز آئی تو امی جی ذرا غصے کے ساتھ بولیں۔ابا جی نے وہیں سے آواز دی بیٹا! جگ بھی توڑ دو۔بیچاری زبیدہ کی تمام تر احتیاط کے باوجود دھلا،دھلایا جگ اٹھاتے وقت جگ بھی ٹوٹ گیا۔زبیدہ نے اس ناگہانی نقصان پر رونا شروع کر دیا۔اب ایک طرف امی جی کی خفگی بھری آواز ہے دوسری طرف زبیدہ کے رونے کی آواز اور تیسری طرف زبیدہ کو شاباش دیتے ہوئے ابا جی کے ہنسنے کی آواز۔۔۔ابا جی کے ہنسنے کا وہی انداز جس میں ہنستے ہنستے ان کی آنکھ سے

پانی بہنے لگتا تھا۔ایک بار امریکہ میں زبیدہ کے ساتھ ٹیلی فون پر ان یادوں کی باتیں ہو رہی تھیں اور ہم دونوں ان پر ہنس رہے تھے۔ہمارے ہنستے ہنستے ابا جی کی آنکھوں کا پانی ہماری آنکھوں میں آ گیا اور ہم دونوں ہی ہنستے ہنستے اپنی بھیگی پلکیں صاف کر رہے تھے۔کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی سی بے معنی یادیں بھی ہماری زندگی میں کتنی بامعنی بن جاتی ہیں۔

(باب ''روح اور جسم'' سے اقتباس)



”سوئے حجاز“ میں
ابا جی/امی جی کا ذکر

اس بار طوافِ کعبہ کے ساتوں چکروں میں مجھے ابا جی کی حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفٰیﷺ سے محبت کے جذبات بار بار یاد آتے رہے۔ مبارکہ آج کا عمرہ اپنی والدہ مرحومہ یعنی میری ممانی مجیدہ کی طرف سے کر رہی تھی اور میں یہ عمرہ ابّا جی کی طرف سے کر رہا تھا۔ پہلے تو اس سوچ کے ساتھ شدّت سے دل بھر آیا کہ آج ابا جی خود زندہ ہوتے اور ہم باپ، بیٹے ایک ساتھ یہ سعادت حاصل کر رہے ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔لیکن پھر یہ درد ابا جی کی مغفرت کے لئے دعاؤں کے ساتھ خدا کی شکر گزاری میں ڈھل گیا کہ مجھ جیسے ملامتی شخص کو نہ صرف اس ارضِ مقدّس میں حاضری کی سعادت بخشی بلکہ ابا جی کی دیرینہ آرزو اُن کی وفات کے باوجود میرے ذریعے سے پوری کرادی۔ درد اور شکر گزاری کی لہریں پھر بھی ایک دوسرے میں مدغم ہوتی رہیں۔ اس سے عمرہ کے سرور میں اضافہ ہوا۔طواف سے سعی تک تمام مراحل میں یہ سرور قائم رہا۔اب سوچتا ہوں کہ ابا جی کی طرف سے وہ عمرہ نہ کرتا تو اس انوکھی لذّت سے آشنا ہی نہ ہوتا جو اس عمرہ کے دوران نصیب ہوئی۔

(باب ”دوسرا عمرہ“ سے اقتباس)

آج مبارکہ نے اپنے والد اور میرے ماموں ناصر کی طرف سے عمرہ کرنا تھا اور میں

نے اپنی امی جی کی طرف سے...امی جی اور ماموں ناصر میں گہری محبت تھی۔شاید یہ اسی محبت کا اثر تھا کہ میرے اور مبارکہ کے عمرے دونوں بہن بھائی کے لئے ایک ہی وقت میں ہو رہے تھے، حالانکہ ہم نے اس سلسلے میں پہلے سے کچھ بھی طے نہیں کیا تھا۔

طواف اور سعی کے دوران امی جی شدت سے یاد آتی رہیں۔ میں ایک عرصہ تک یہی سمجھتا رہا ہوں کہ دنیا کی ساری مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔لیکن دنیا کو دھیان سے دیکھا تو لوگوں کی ناگنوں اور ڈائنوں جیسی مائیں بھی دیکھیں۔اپنی اولاد کے گھروں کو خود اجاڑ دینے والی مائیں، بہو دشمنی میں بیٹوں کی زندگی میں زہر گھول دینے والی مائیں اور حرص وہوس کی ماری، ممتا کے نور سے عاری مائیں۔ جب سے میں نے لوگوں کی ایسی مائیں دیکھی ہیں اپنی والدہ مرحومہ سے میری محبت کا تعلق اور بھی گہرا ہو گیا ہے۔ایسی مائیں بہت کم ہوتی ہیں جو اپنے جذبوں، اپنی خوشیوں اور اپنی خواہشوں کی خاموشی کے ساتھ قربانی دیتی چلی جائیں اور اولاد کو کبھی اشارتاً بھی اس کا احساس نہ دلائیں۔ مجھے ایک طرف امی جی کی محبتوں اور دعاؤں کی پھوار بھگو رہی تھی تو دوسری طرف بی بی ہاجرہ کی عظیم ہستی شفقت کے بادل کی طرح میری روح پر چھائی ہوئی تھی۔

(باب ”تیسرا عمرہ“ سے اقتباس)

میرا یہ عمرہ اپنے دادا جی کی طرف سے تھا۔

میرے پردادا حضرت میاں میر محمد گڑھی اختیار خاں (خانپور) کے ایک اہم پیر تھے۔ ”آبائی پیشہ“ یہی سلسلہ تھا۔ میرے دادا جی میاں اللہ رکھا اس لحاظ سے انقلابی آدمی تھے کہ انہوں نے معصوم اور بے خبر لوگوں کے سامنے روحانیت کا ڈھونگ رچا کر ان کے جذبوں کا استحصال کرنے کی بجائے یہ سلسلہ ہی ترک کر دیا۔گڑھی کو چھوڑ کر خانپور چلے آئے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے ہی دادا جی فوت ہو گئے تھے۔ میں نے ان کی تصویر بھی نہیں دیکھی۔لیکن میرے لہو میں اور میری سانسوں میں ان کی ایک تصویر ہے جو میری ہی طرح ہے...میں اپنے ننھالی رشتہ داروں میں بعض ایسے کزنز کو جانتا ہوں جنہیں اپنے دادا کی محبت اور شفقت ملی لیکن وہ اس بے بہا دولت کی

قدر نہ کر سکے۔اپنے دادا جی سے میری محبت بے شک میرے اندر سے پھوٹی تھی لیکن اس کا بیج تو ابا جی نے بویا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اپنے بزرگوں کی اس محبت کو میں اپنی اولاد کے اندر بھی اُگا سکا ہوں۔’’اللہ کو اسی طرح یاد کرو جیسے اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ‘‘... پر جو لوگ اپنے باپ دادوں تک کو بھلا بیٹھے ہوں وہ اللہ کو بھی کیا یاد کریں گے...میں اللہ کو یاد کروں نہ کروں پر اپنے باپ دادوں کو ہمیشہ یاد رکھتا ہوں۔بہر حال آج کا عمرہ اس لحاظ سے پُر لطف رہا کہ میں ایک طرف اپنے دادا جی کے لئے دعائیں کر رہا تھا تو دوسری طرف اپنی اولاد کے لئے دعائیں کرتے ہوئے خود دادا بن جانے کی تمنا کر رہا تھا۔

(باب’’پانچواں عمرہ‘‘ سے اقتباس)

میں اوپر کی منزل پر کھڑا ہونے کے باعث کعبہ کی چھت سے زیادہ اونچائی پر تھا۔ ہلکا سا احساس ہوا کہ کہیں یہ بے ادبی نہ ہو....پھر مجھے اپنے بچپن کے وہ منظر یاد آئے جب ابا جی میری ننھی منی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے پیار سے اونچا اٹھا لیتے تھے۔تب میں ابا جی سے اتنا چھوٹا ہونے کے باوجود ان سے اونچا ہو جاتا تھا۔پر رہتا تو اُنہیں کے ہاتھوں میں تھا۔ساتھ ہی قرآن شریف کی اس آیت کو یاد کر لیا کہ خدا کو اس طرح یاد کرو جیسے اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو....سو بے ادبی کا احساس کم ہونے لگا۔

--------۔میرا عمرہ اپنی دادی اماں’’صاحب خاتوں‘‘ کی طرف سے تھا۔

میری دادی اماں تب فوت ہو گئی تھیں جب ابا جی کی عمر چھ سال کے لگ بھگ تھی۔ابا جی رحیم یار خاں میں قیام کے عرصہ میں ہر سال محرّم کی دس تاریخ کو ہم سب کو قبرستان لے جاتے۔وہاں دادی جان کی قبر پر دعا کرتے۔جب ہم خانپور آ گئے تب سے ابا جی کا جب بھی کسی کام سے رحیم یار خاں جانا ہوتا وہ دادی جان کی قبر پر دعا کرنے کے لئے ضرور جاتے۔مجھے یاد ہے ایک بار ابا جی رحیم یار خاں سے واپس آئے تو بے حد اداس لگے۔بتانے لگے قبرستان بہت پھیل گیا ہے۔ تلاش کے باوجود اماں کی قبر نہیں ملی پھر قبرستان کے گیٹ پر ہی دعا کر کے آ گیا ہوں۔قبر کیا کھوئی

تھی ایسے لگا تھا جیسے دادی جان ابھی ابھی فوت ہو گئی ہیں۔یہ قبروں کا بھی عجیب سا جادو ہوتا ہے۔ مٹی کا جادو....شاید دھرتی ماں کی کشش ہوتی ہے:

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

(باب’’چھٹا عمرہ‘‘ سے اقتباس)

☆☆☆

''انٹرویوز'' میں ابا جی/امی جی کا ذکر

سوال: آپ کا بچپن کہاں اور کیسے گزرا؟ وہاں کی کوئی یادیں؟

جواب: میرے بچپن اور لڑکپن کا بیشتر حصہ رحیم یار خاں اور خان پور میں گزرا۔ چونکہ شروع میں ہمارا گھر خوشحال تھا اس لئے ابتدائی عرصہ تو بہت اچھا گزرا لیکن جب ابا جی کا کپڑے کا کاروبار زوال کا شکار ہوا تو ہماری تکالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم نے تنگ دستی کا ایک طویل زمانہ کاٹا۔ اس کے باوجود بچپن ویسے ہی گزرا جیسے میرے معاشرے کے عام بچوں کا گزرتا ہے۔

(حیدر قریشی سے انٹرویو، از: ڈاکٹر صابر آفاقی)

سوال۶: ادب اور شاعری سے وابستگی کے بنیادی محرکات کیا تھے۔؟

جواب: میں اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ تاہم میری زندگی کے ابتدائی ایام ایک متوسط گھرانے کی متوسط خوشحالی کے ایام تھے۔ ابا جی کا کپڑے کا بزنس خراب ہوا تو ہم لوگ بھیانک غربت کی زد میں آ گئے ۔۔ سو کم عمری میں پڑھائی چھوڑ کر نوکری کر لی تا کہ ابا جی کا بوجھ بٹا سکوں۔ ہر چند خدا کے فضل سے پرائیویٹ طور پر اپنی پڑھائی بھی مکمل کر لی، لیکن معاشرتی ناانصافیوں اور زیادتیوں نے میری روح میں بے شمار گھاؤ پیدا کئے۔ ممکن ہے زندگی کا یہ سارا کھیل تماشہ ادب سے میری وابستگی کا محرک رہا ہو۔

(سلطانہ مہر کے بیس سوالوں کے جواب)

سوال نمبر۹: اپنی زندگی کے چند اہم اور دلچسپ واقعات ضرور لکھیے۔

جواب: اہم واقعات کے لیے ضروری نہیں کہ دلچسپ بھی ہوں۔ بہر حال میری زندگی کے اہم واقعات میں سب سے اہم واقعہ (سانحہ) میرے والد صاحب کی وفات کا تھا۔ ہمارے خاندان میں طویل مدت کے بعد یہ پہلی فوتگی تھی۔ اس سے مجھے ہجر کے ایک نئے رُخ سے شناسائی ہوئی۔ ابا جی سے میری ہر سطح پر گہری وابستگی تھی ان کی جدائی نے مجھے باہر سے زیادہ اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کے بعد دو سال کے اندر اندر والدہ صاحبہ بھی فوت ہو گئیں۔ امی جی کی وفات میری زندگی کا دوسرا اہم واقعہ تھا۔ ابا جی کی وفات نے جس ہجر سے آشنا کیا تھا امی جی کی وفات اسی ہجر توسیع تھی۔ لیکن اس ہجر کے دکھ نے مجھے تخلیقی سطح پر متحرک کیا۔ میری تخلیقات میں رشتوں کی جو خاص اہمیت ظاہر ہوئی ہے وہ انہیں فوتگیوں کا نتیجہ ہے۔

(سلطانہ مہر کے دس سوالوں کے جواب)

وسیم انجم: حیدر قریشی صاحب! سب سے پہلے ہمیں اپنے خاندان کے پس منظر سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بتائیے کہ آپ سے قبل ایسی صلاحیتوں کی مالک کوئی شخصیت ادب کے آسمان پر اس طرح جگمگائی جس حیثیت سے آپ آسمان ادب کے افق پر روشن ستارہ ہیں۔ اور کیا نسل نو میں بھی ایسے جراثیم پائے جاتے ہیں؟

حیدر قریشی: میرے والد صاحب کی کپڑے کی دوکان تھی۔ ہمارا خاندان متوسط طبقے کا خوشحال گھرانہ تھا۔ لیکن جب ابا جی کا کاروبار زوال کا شکار ہوا تو نہ صرف ابا جی کلاتھ مرچنٹ سے ٹیلرنگ شاپ تک آ گئے بلکہ ہم لوگ بے حد تکلیف دہ غربت کی زد میں آ گئے۔ میرے خاندان میں صرف میری امی جی کو ادب کے مطالعہ کا شوق تھا۔ ایک زمانے میں انہوں نے پنجابی میں ایک دعائیہ نظم بھی کہی تھی۔ ہاں میرے میرے سب سے چھوٹے ماموں حبیب اللہ صادق کسی زمانے میں شاعری کرتے تھے۔ اور میں بچپن

میں انہیں حیرت اور خوشی سے دیکھا کرتا تھا۔ کہ میرے ایک ماموں شاعر بھی ہیں۔
باقاعدہ طور پر میں ہی ادبی دنیا میں آیا ہوں۔نسل نو میں ابھی تک کوئی بچہ ایسا نہیں ہے
جس سے امیدیں وابستہ کی جاسکیں۔اپنی چھوٹی بیٹی سے مجھے کچھ توقع تھی۔لیکن ابھی
تک کوئی بہتر اور یقینی صورت نظر نہیں آ رہی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ میرے دونوں
چھوٹے بچے ٹیپو اور مانو عام طور پر میری نئی تحریریں میرے پاس آ کر مجھ سے سنتے
ہیں۔اور پھر انہیں پڑھتے بھی ہیں۔جرمنی میں شاید یہ بھی غنیمت ہے۔

(حیدرقریشی سے ایک مکالمہ از ڈاکٹر وسیم انجم)

نذر خلیق: کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ آپ کے افسانوں میں انسانی کردار حقیقت سے بہت قریب
تھے اسی لئے آپ کو افسانے سے خاکہ نگاری کی طرف آتے ہوئے سہولت ہوئی؟

حیدرقریشی: بالکل کہہ سکتے ہیں۔کہیں اندر ہی اندر تدریجاً میں اسی طرف آ رہا تھا۔ویسے اس کی
فوری وجہ ابا جی کی وفات تھی۔ان کی وفات کے بعد میں نے ان کے بارے میں چند
باتوں کو یکجا کرنا چاہا تو وہ باتیں خاکہ کا روپ اختیار کر گئیں۔

نذر خلیق: یہ سارے خاکے لکھتے ہوئے آپ کو کیسا محسوس ہوتا رہا؟

حیدرقریشی: ویسا ہی محسوس ہوتا رہا جیسا اپنی کسی تخلیق کی تکمیل پر ہوتا تھا، یا شاید باقی تخلیقات سے
تھوڑا سا زیادہ اچھا محسوس ہوتا رہا۔میرے والدین اور دوسرے عزیز کسی نہ کسی رنگ
میں میری زندگی کی طرح میری دوسری تخلیقات میں بھی موجود تھے۔ان خاکوں میں وہ
زیادہ نمایاں ہو کر شریک ہوئے۔ایک اور احساس شگفتگی اور مزاح کا ہے جسے بیشتر قارئین
نے ظاہری سطح پر لیا ہے۔جبکہ میرا بنیادی اور ابتدائی تجربہ تو کرب کا تھا جو اس خاکہ نگاری کا
محرک بنا۔سو آپ دیکھیں کہ ان خاکوں کی شگفتگی میں کرب اور دکھ کی لہریں موجود
ہیں۔کم از کم مجھے تو محسوس ہوتی رہتی ہیں۔

(مطبوعہ، سہ ماہی توازن مالیگاؤں، شمارہ:۴۰ و ''حریم ادب'' بورے والا۔کتاب نمبر۲)

محمد عاصم بٹ: بچپن میں گھر میں کتاب بینی کی کیا صورت تھی؟ کتابوں سے تعلق کیسے بنا؟

حیدرقریشی: اسکول میں داخلہ سے پہلے والد صاحب مجھے دوکان پر اردو سکھایا کرتے تھے۔میں
نے پہلی جماعت میں داخلہ سے پہلے اخبار پڑھنا شروع کر دیا تھا۔گھر پر والد صاحب
کے پاس دینی کتب کا ذخیرہ موجود تھا،انہیں بھی سرسری دیکھا کرتا تھا۔تب میرے
پیش نظر موضوع نہیں اردو زبان ہوا کرتی تھی۔سو اردو میں جو کچھ بھی سامنے آتا تھا پڑھ
لیا کرتا تھا۔یہ سب والد صاحب کی دی ہوئی بالکل ابتدائی تعلیم و تربیت کا ثمر تھا۔اسی
عادت نے کتاب بینی تک پہنچایا۔

(حیدرقریشی سے انٹرویو از محمد عاصم بٹ)

سوال: آپ نے اپنے افسانوں میں خوبصورت عورت کو استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔کوئی
خاص وجہ؟

جواب: عورت کے کئی روپ ہیں جو میرے افسانوں میں آئے ہیں۔ان میں ماں، بہن،
بیوی، بیٹی تک کے رشتے موجود ہیں۔انتہائی مظلوم عورت (شناخت) کا کردار بھی
موجود ہے۔گویا دیگر کئی روپ میں عورت موجود ہے۔مقدس رشتوں میں بھی یہ روپ
خوبصورت ہی ہیں۔بلکہ یاد آیا مجھے کتابی چہرے اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ میری والدہ
کا چہرہ کتابی تھا اور میری اہلیہ بھی ان کی بھتیجی ہونے کی وجہ سے ان سے مشابہت رکھتی
ہیں۔سو میرے لیے عورت کی خوبصورتی کا محور میری ماں اور انہیں کے حوالے سے
میری بیوی ہیں۔

(رضینہ خان کے سوال، حیدرقریشی کے جواب)

سوال: کیا شاعری کرنے کے لیے شاعر کا کسی سے محبت کرنا اور اس وجہ سے اس کے کسی
محبوب کا ہونا لازمی ہے؟

جواب: محبت کرنا، کسی کو چاہنا اور چاہے جانا ایک مشترکہ انسانی جذبہ ہے۔اس کے لیے شاعر ہونا لازم نہیں ہے۔محبت کا انسانی جذبہ گھر میں ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، بہن بھائی، بیوی بچے، قریبی عزیز و اقارب کی محبت سے ہوتا ہوا چلتا ہے۔اس میں کہیں کوئی خاص محبوب بھی آ جاتا ہے۔تو یہ عام انسانی زندگی میں ہوتا ہے۔شاعر بھی اسی انسانی زندگی کا حصہ ہے سو وہ بھی اپنے نصیب کے مطابق اپنا حصہ پاتا ہے۔میں پہلے بھی ایک جگہ وضاحت کر چکا ہوں کہ اگر محض عشق و محبت کی وجہ سے شاعر بنتے تو پھر مجنوں، فرہاد، رانجھا، مہینوال، پنّوں، وغیرہ بڑے شعراء میں شمار ہوتے۔سو ایسا کچھ بھی لازم نہیں۔یہ سب انسانی جذبات و نفسیات کا حصہ ہے، اور شاعر بھی اسی انسانی ہجوم کا حصہ ہے۔

(حیدر قریشی کا ''تصوّرِ محبوب''۔ایک مکالمہ، از: فرزانہ یاسمین)

•۔ادبی رجحان کب اور کیسے ہوا اور اس میں کن اہل قلم سے متاثر ہوئے اور کن سے رہنمائی لی؟

ح۔ق: اسکول جانے سے پہلے ابا جی سے اردو پڑھنے، لکھنے کی جو تربیت حاصل کی، اس سے کتب بینی کا شوق ہوا اور پھر وہی کسی نہ کسی طور میری ادبی تربیت کا موجب بن گیا۔

(جرمنی میں مقیم شاعر، ادیب و محقق حیدر قریشی سے گفتگو از خالد یزدانی)

ش۔خ: ادبی اور معاشرتی زندگی میں آپ کو کن کن شخصیات نے متاثر کیا ہے؟

ح۔ق: سب سے پہلے میرے ابا جی اور امی جی کی شخصیات کا اثر ہے۔بلکہ میں خود کو انہیں کا پرتو سمجھتا ہوں۔خاندان کے افراد میں دادا جی کو دیکھا تو نہیں لیکن انہیں اَن دیکھی محبت کی طرح جانتا ہوں اور ان سے متاثر ہوں، پھر نانا جی، بے جی، بابا جی (تایا)، ماموں ناصر، ان سب کی شخصیات کا مجھ پر اثر ہے۔بھائی بہنوں، بیوی اور بچوں کا بھی کسی نہ

کسی طور اثر مرتب ہوا ہے۔

(حیدر قریشی سے دس سوالات، از: شبنم خان)

والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ ان کے بزرگوں کے زمانے میں بخاری شریف کی زیارت ہو جانا ہی بہت بڑی سعادت اور بہت بڑا کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔کہاں سو، سوا سو سال پہلے کا وہ زمانہ اور کہاں آج کی دنیا کہ بخاری شریف سمیت حدیث کی ساری کتب آن لائن دستیاب ہیں اور ان کے اردو ترجمے بھی موجود ہیں۔قرآن شریف کے مختلف تراجم کی دستیابی کے ساتھ قرات سکھانے کا خودکار نظام تک مہیا کر دیا گیا ہے۔یہی صورتِ حال دوسرے مذاہب کی کتبِ مقدسہ کے معاملہ میں ہے۔

(مضمون ''ادب، میڈیا اور انٹرنیٹ'' از حیدر قریشی)

☆☆☆

شاعری میں ابا جی اور امی جی کا ذکر

غزلوں میں

حیدؔر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابّا بھی چل بسے،تری ماں بھی نہیں رہی

ابھی تو قول اپنے باپ کا ہم نے نبھانا ہے
ابھی اپنے مقدر کا کڑا بَن باس باقی ہے

یہ ساری روشنی حیدر ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس وقمر میں جو نور خاک میں ہے

ماں ! ترے بعد سے سورج ہے سوا نیزے پر
بس تری ممتا کا اک سایہ بچاتا ہے مجھے

صورت ابُو کی اُبھر آئی مِرے چہرے میں
دے گئی کیسی خوشی جاتی جوانی اپنی

آج اولاد کے آئینے میں حیدؔر ہم نے
تازہ کرلی ہے ہر اک یاد پرانی اپنی

ماہیے

برگد کی جٹائیں ہیں
ساتھ مِرے اب بھی
ابو کی دعائیں ہیں

☆☆☆

تب آنکھ برستی ہے
دل میں کہیں چھپ کر
ماں جب مِری ہنستی ہے

☆☆☆

لگتی تھی دُعا ماں کی
نیم شبی شبنم
اور چاندنی کی جھانکی

☆☆☆

نظم

دعا گزیدہ

سلامت رکھنا مولا !
سر پہ سایہ میرے ابوؒ کا۔۔۔۔۔۔دعا مانگی'
کھلی آنکھیں تو میں دشتِ جدائی میں
سلگتی ریت پر تھا پا برہنہ سا

پھر امی جی کی لمبی عمر کی میں نے
دعائیں کیں
اک آندھی سی چلی اندھی جدائی کی
تو ماں بھی چھِن گئی مجھ سے

کھلے دشتِ جدائی میں سَوا نیزے پہ
سورج جیسی کوئی شے اُتر آئی
تو پھر سائے کی خواہش بھی
دعا کے روپ میں ڈھلنے سے
صاف انکار کر بیٹھی

اسے یہ خوف تھا سائے کے بدلے میں
کہیں سورج ہی سر پر ٹوٹ کر نہ گر پڑے

ہر اک خواہش دعا کے روپ میں
ڈھلنے سے خائف ہے
مگر مولا !
مجھے تجھ سے نہ کوئی بدگمانی ہے
نہ کوئی بے یقینی ہے
دعا کی استجابت کا یقیں بھی ہے
مگر مولا۔۔۔۔۔۔۔مجھے اپنے
سبھی باقی عزیزوں سے محبت ہے
ابھی میں ان کو کھو دینا نہیں ہوں چاہتا مولا !
سو ان کے واسطے کچھ بھی نہیں ہے مانگنا تجھ سے
معافی مانگتا ہوں اب فقط
پچھلی دعاؤں کی !

☆☆☆

مختلف یونیورسٹی مقالات میں والدین کا تذکرہ

۱۔ حیدرقریشی شخصیت اورادبی جہتیں۔۔۔ڈاکٹرعبدالرب استاد(تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی ۲۰۱۳ء)

(گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ،کرناٹک،انڈیا)

۲۔ حیدرقریشی کی ادبی خدمات۔۔۔عامر سہیل(تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو،۲۰۱۴ء)

(ہزارہ یونیورسٹی،مانسہرہ،پاکستان)

۳۔ حیدرقریشی کی شاعری کا مطالعہ۔۔۔ہردے بھانو پرتاپ(ایم فل کا مقالہ،سال ۲۰۱۴ء)

(جواہرلال نہرو یونیورسٹی،دہلی۔انڈیا)

۴۔ حیدرقریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ۔۔۔رضینہ خان(ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۴ء)

(جواہرلال نہرو یونیورسٹی،دہلی۔انڈیا)

۵۔ حیدرقریشی کی شاعری کی روشنی میں بیرونی ممالک کی اردو شاعری۔''تنقیدی مطالعہ اور ترجمہ''

شعر المهجر عند حيدر قريشي ''دراسة تحليلية نقدية مع الترجمة''

احمد عبدربہ عباس عبدالمنعم (ایم اے کا مقالہ سال ۲۰۱۵ء)۔ازہر یونیورسٹی۔قاہرہ،مصر

ابا جی اورامی جی کے نام بعض کتب کے انتساب

محبت کے پھول

(ماہیوں کا مجموعہ۔مطبوعہ 1996)

امی جی کے نام

پھولوں کی ہے نرمی بھی
اس کی محبت میں
صحراؤں کی گرمی بھی

دعائے دل

(غزلوں اور تین نظموں کا مجموعہ۔مطبوعہ 1997ء)

ابا جی کے نام

یہ آنکھ کے آنسو ہیں کہ ساون کی جھڑی ہے
قابو میں نہیں دل کہ حضوری کی گھڑی ہے

قفس کے اندر

(چھ شعری مجموعوں کا عوامی کلیات۔مطبوعہ 2013ء۔صفحات 152)

ابا جی اور امی جی کے نام

حیدؔر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابا بھی چل بسے، تری ماں بھی نہیں رہی

قفس کے اندر (ای بک)

(چھ شعری مجموعوں کا عوامی کلیات۔مطبوعہ 2014ء۔صفحات 618)

http://kuliat-library.blogspot.com/

ابا جی اور امی جی کے نام

نبھانا ہے ابھی تو قول اپنے باپ کا ہم نے
ابھی اپنے مقدر کا کڑا بَن باس باقی ہے

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

خواب کے اندر خواب (ای بک)

(تخلیقی نثر کے چھ مجموعوں کا مجموعہ۔مطبوعہ 2014ء۔صفحات 832)

http://kuliat-library.blogspot.com/

ابا جی اور امی جی کے نام

حیدؔر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابا بھی چل بسے، تری ماں بھی نہیں رہی

غزلیں، نظمیں، ماہیے

(چار شعری مجموعوں کا مجموعہ۔مطبوعہ 1998ء۔صفحات 384)

چار شعری مجموعوں میں ''سلگتے خواب'' اور ''عمرِ گریزاں'' کے ساتھ ''محبت کے پھول'' اور ''دعائے دل'' بھی شامل ہیں اور ان دونوں کے انتساب پہلے ایڈیشنز کی طرح شامل ہیں۔

''حیدر قریشی فن اور شخصیت''

(مرتبین: نذیر فتح پوری، سنجئے گوڑ بولے، مطبوعہ 2002 ء، صفحات 192)

انتساب

حیدر قریشی کے والد محترم

قریشی غلام سرور صاحب مرحوم کے نام

جو حیدر قریشی کی تخلیقات میں آج
بھی زندگی بسر کرتے دکھائی دیتے ہیں
اور جن کے خوابوں کی تعبیر
حیدر قریشی کی ادبی زندگی کے رُوپ میں موجود ہے

منشا یاد / ہانی السعید

خاکوں کے مجموعہ ''میری محبتیں'' پر دو مضامین کے اقتباس

منشا یاد (اسلام آباد)

میرے خیال میں حصہ اول کے خاکے نسبتاً زیادہ پر اثر اور دلچسپ ہیں اور ان میں مصنف ہر شخصیت کی کلید دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں خاکہ نگاری کی ایک اور خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی بنیاد سچائی پر استوار ہو اور اس میں فکشن کی ملاوٹ نہ ہو اور یہ بھی کہ شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ خرابیاں بھی بتائی جائیں مگر ایسے طریقے اور سلیقے سے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ اپنے عزیز و اقارب کے خاکے لکھتے ہوئے دراصل آپ اپنا خاکہ بھی لکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر اس میں مبالغہ، خود پسندی، تصنع اور فکشن شامل کریں گے تو وہ صاف نظر آجائے گی اور آپ کی تحریر کو اپنے درجے سے گرا دے گی۔ مگر حیدر قریشی نے سچ کا دامن کہیں نہیں چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں متاثر کرنے کی قوت ہے۔ ان کے خوبصورت اندازِ تحریر نے اسے اور بھی دلنشین بنا دیا ہے۔

اولاد کے لئے باپ ایک گھنے اور سایہ دار درخت کی مانند ہوتا ہے۔۔۔۔۔اس لئے والد کے خاکے کا عنوان برگد کا پیڑ سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ حیدر قریشی اپنے برگد کے پیڑ کا تعارف اس طریقے سے کراتے ہیں کہ ان کی ظاہری و باطنی شخصیت آنکھوں میں گھوم جاتی ہے:

''ابا جی وضع دار انسان تھے۔ روایات سے محبت رکھتے تھے مگر زمانے کے ارتقا کی سچائی

کو مانتے تھے۔1960ء تک پھند نے والی رومی ٹوپی پہنتے رہے۔اس ٹوپی کو ترکی ٹوپی بھی کہتے تھے۔پھر کلاہ کے ساتھ لنگی باندھنی شروع کی اور جناح کیپ بھی استعمال کرتے رہے۔آج ابا جی کی ساری زندگی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے ان کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ،ایک آریا اور ایک عرب بیٹھا نظر آتا ہے''

آگے چل کر وہ ان کی بعض دوسری عادتوں اور خوبیوں کا ذکر کرتے اور بتاتے ہیں کہ دیگر بزرگوں کے برعکس انہیں موسیقی سے رغبت نہیں تھی۔لیکن اسے شجرِ ممنوعہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ لوک گیت اور صوفیانہ کلام سن کر جھومنے لگتے۔اپنے والد کے بارے میں انہوں نے ایک اور دلچسپ اور راز کی بات بتائی ہے کہ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔پہلی نے اس الزام کی بنیاد پر عدالت کے ذریعے طلاق لے لی کی یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔پھر ان کی شادی حیدر قریشی کی والدہ سے ہوئی تو یکے بعد دیگرے دس بچے پیدا ہوئے۔اور مطلقہ بیوی دوسری جگہ شادی کر کے بھی اولاد سے محروم رہی۔مگر اپنے ابا کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بارے میں بھی کچھ چھپا کر نہیں رکھتے اور اپنے بچپن کے حالات بھی اسی سچائی اور دیانتداری سے بیان کرتے ہیں جو ان کے خاکوں کی اصل خوبی اور کامیابی کا راز ہے:

''یوں تو ہر انسان اپنے بچپن میں فطرت سے بہت قریب ہوتا ہے لیکن مجھے بچپن میں فطرت سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا چنانچہ جیسے ہی موقع ملتا الاسٹک والی نیکر اور بٹنوں والی شرٹ اتار کر فطری لباس میں گھومتا رہتا۔ایک بار اسی لباس میں گلیوں میں گھومتا پھرتا بہت دور نکل گیا۔وہاں ابا جی اپنے دوست کی دکان پر کھڑے تھے۔میں جا کر 'ابوا' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔وہ سمجھے کوئی اور بچہ ہے جو خواہ مخواہ ان سے چمٹ گیا ہے۔انہوں نے مجھے پرے دھکیل دیا مگر میں پھر لپٹ گیا۔وہ میری طرف غور سے دیکھے بغیر دھکیلتے اور میں بار بار چمٹتا رہا۔ اتنے میں ان کے دوست کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔اس نے کہا''قریشی صاحب یہ تو حیدر ہے''

اپنے والد کی عادات،مزاج اور ہر طرح کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کا احوال انہوں نے خوب تفصیل سے بتایا ہے۔اور اس خوبی سے کہ وہ جانے پہچانے اور اپنے اپنے سے

لگنے لگتے ہیں۔ان کی وفات کے بعد انہوں نے ایک روحانی کرامت کا ذکر بھی کیا ہے۔اور حالانکہ ان کی زندگی میں ان کی والدہ نے کبھی انہیں بزرگ تسلیم نہ کیا تھا مگر اب وہ بھی حیران تھیں۔ حیدر قریشی بتاتے ہیں کہ وفات کے تیئسویں دن،رات نو بجے کے بعد اس کمرے کی کھڑکی سے گلاب کی خوشبو کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں جو ان کے ابا جی کا ذاتی کمرہ تھا۔یہ خوشبو پہلے ان کی والدہ نے محسوس کی اور انہیں کمرے میں بلایا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں بھی گلاب کی تیز خوشبو کا احساس ہوا۔میں حیدر قریشی کا یہ بیان پڑھ کر تھوڑا سا پریشان ہو گیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ میں تو انہیں نہایت عقلی،ریشنل اور سائنسی سوچ کا حامل سمجھتا تھا یہ انہوں نے کرامتوں اور معجزوں کی کیا باتیں شروع کر دی ہیں مگر جونہی میں نے آخری جملہ پڑھا،اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ لکھا تھا:۔۔۔۔۔''یہ خوشبو کیا تھی؟اتنی سی بات ہی کچھ سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آنکھ خواب تخلیق کر سکتی ہے تو قوتِ شامہ بھی خوشبو تخلیق کر سکتی ہے''

اپنی والدہ کا خاکہ بھی انہوں نے نہایت ڈوب کر لکھا ہے اور بعض ایسے دلچسپ واقعات کا تذکرہ کیا ہے جس سے نہ صرف والدہ کی سیرت و کردار پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کا اپنا بچپن بھی نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ایک بار انہوں نے کسی لڑکے کو گالی دیتے ہوئے سنا جو انہیں بہت پسند آئی اور انہوں نے بھی ارشاد فرما دی۔ان کی والدہ کو پتہ چلا تو ان کی خوب مرمت کی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے گالی دینا بھول گئے۔ایک اور دلچسپ واقعہ انہی کی زبان سے سنئے:

''بچپن میں امی جی نے ایک دفعہ میری شرارتوں سے تنگ آ کر مجھے ابا جی کے ساتھ دکان پر بھجوا دیا۔ابا جی نے وہاں سزا کے طور پر میری ٹنڈ کرا دی۔میں خوشی سے چھلانگیں مارتا ہوا گھر آیا اور امی جی سے کہا:امی جی،امی جی میں بھی ابو کی طرح ہو گیا ہوں۔اب میں بھی ابو بن جاؤں گا اور پھر اپنے بچوں کو ڈانٹا کروں گا''

(مضمون''میری محبتیں''از منشا یاد،سے اقتباس
مطبوعہ عکاس اسلام آباد۔حیدر قریشی نمبر۔اکتوبر ۲۰۰۵ء)

ہانی السعید (مصر)

میں حیدر قریشی کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ ان کے والد محترم ''کے دونوں خوابوں کی تعبیر کا ابھی تک تو دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا''۔۔کیونکہ ان کے اباجی کے خوابوں کی حالیہ قطعی تصدیق سے ان کی بزرگی کے بڑے کرشمے آشکار ہو چکے ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر انور سدید کے الفاظ دہرا سکتا ہوں کہ ''برگد کا پیڑ، اجلے دل والا، زندگی کا تسلسل، پسلی کی ٹیڑھ، بے حد معنی خیز خاکے ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ جن لوگوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر رہا ہے وہ حقیقی معنوں میں عظیم تھے''۔اس میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ مائے نی میں کنوں آکھاں، ڈاچی والیا موڑ مہار وے، مظلوم متشدد، مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ، رانجھے کے ماموں، اور محبت کی نمناک خوشبو، کے زیرِ عنوان خاکے بھی اتنے ہی شاندار ہیں جتنے دوسرے خاکے۔

(''سچے عظیم لوگوں کی تصویریں''از ہانی السعید سے اقتباس
مطبوعہ سہ ماہی ادب ساز دہلی۔شمارہ جنوری تا جون ۲۰۰۸ء)

پل صراط پر چلتا ہوا ہمارا خاندان اور اباجی کے دو خواب

''اباجی بتاتے تھے کہ ہمارے خاندان میں کئی پشتوں سے بیٹوں کی کمی چلی آ رہی تھی۔ ایک بزرگ کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔ان بیٹوں میں سے ایک کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔ان میں سے بھی ایک کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔میاں میر محمد کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے۔میاں سعید بے اولاد رہے۔میاں غوث محمد کے ہاں ایک بیٹا ہوا مگر اگلے مرحلے میں ان کی نسل بھی ختم ہوگئی۔میاں اللہ رکھا کے ہاں دو بیٹے ہوئے، باباجی اور اباجی۔۔باباجی کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور اباجی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

اباجی نے دو شادیاں کیں۔پہلی بیوی عزیز بی بی نے اس الزام کی بنیاد پر عدالت کے ذریعے طلاق لی کہ یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔پھر اباجی کی شادی ہماری امی جی سے ہوئی اور یکے بعد دیگرے دس بچے پیدا ہوئے۔پانچ بیٹے، پانچ بیٹیاں۔۔عزیز بی بی نے دوسری جگہ شادی کر لی مگر اولاد سے محروم رہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میری پیدائش سے چند ماہ پہلے اباجی نے یکے بعد دیگر دو خواب دیکھے تھے۔پہلا خواب یہ تھا کہ ایک بڑا اور گھنا درخت ہے جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔اباجی اس درخت کے اوپر عین درمیان میں کھڑے ہوئے ہیں۔یہ خواب سن کر اباجی کے ایک دوست روشن دین صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا جو.....

دوسرا خواب یہ تھا کہ لمبے لمبے قد والے بہت سارے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ بلند کر کے ''حیدر۔۔حیدر'' کے نعرے لگا رہے ہیں۔ان دونوں خوابوں کے چند ماہ بعد میری پیدائش ہوئی۔ اباجی نے اپنے مرشد کو خط لکھا کہ بیٹے کا نام تجویز فرما دیں۔مرشد کو اباجی کے خواب کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے حیدر بنا دیا۔مگر اباجی کے دونوں خوابوں کی تعبیر کا ابھی تو دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔شاید حسن اتفاق تھا کہ میں پیدا ہو گیا اور حیدر نام رکھا گیا۔''

(''میری محبتیں'' میں شامل خاکے ''برگد کا پیڑ'' سے دو اقتباس)

ابا جی کے خوابوں کی تعبیر کے ادبی پہلو کی تکمیل کے شواہد

انٹرنیٹ پر حیدر قریشی کی کتابوں کی دستیابی نہایت مربوط اور آسان،

شعری مجموعے

سلگتے خواب،۔۔عمرِ گریزاں،۔۔محبت کے پھول،۔۔دعائے دل،۔۔درد سمندر،۔۔زندگی،

نثری مجموعے

روشنی کی بشارت،۔۔۔قصے کہانیاں،(افسانے)۔۔۔میری محبتیں (خاکے)

کھٹی میٹھی یادیں،۔۔۔قربتیں،فاصلے (انشائیے)،۔۔۔ سوئے حجاز (سفرنامہ)

تحقیق و تنقید

حاصلِ مطالعہ،۔۔تاثرات،۔۔مضامین اور تبصرے،۔۔مضامین ومباحث

ستیہ پال آنند کی بودنی،نابودنی،۔۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت،

وزیر آغا عہد ساز شخصیت،

ماهیا کے حوالے سے تحقیق و تنقید

اردو میں ماہیا نگاری،۔۔۔اردو ماہیے کی تحریک،

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما،۔۔۔اردو ماہیا،۔۔۔ ماہیے کے مباحث،

حالاتِ حاضرہ

منظر اور پس منظر،۔۔۔خبرنامہ،۔۔۔اِدھر اُدھر سے،۔۔۔چھوٹی سی دنیا،

حیدر قریشی کی مذکورہ بالا تمام کتابیں،الگ الگ کتاب کی صورت میں اس لنک پر دستیاب ہیں

http://my27books.blogspot.de/

انٹرنیٹ پر حیدر قریشی کی کتابوں کی پیش کش کا ایک اور انداز

چھ شعری مجموعے ایک جلد میں

''قفس کے اندر''

۱۵۲صفحات کے عوامی ایڈیشن اور ۶۱۸ صفحات کے انٹرنیٹ ایڈیشن دونوں ساتھ ساتھ

افسانوں،خاکوں،یادوں،انشائیوں اور سفرناموں پر مشتمل چھ نثری مجموعے ایک جلد میں

''خواب کے اندر خواب''

اردو ماہیے کی تحقیق وتنقید پر مشتمل پانچ کتابیں ایک جلد میں

''اردو ماہیا تحقیق وتنقید''

علمی وادبی موضوعات پر چھ تنقیدی مجموعے ایک جلد میں

''ہمارا ادبی منظرنامہ''

پانچ شعری اور چھ نثری مجموعوں پر مشتمل میگزین سائز کتاب

''عمرِ لاحاصل کا حاصل''

مذکورہ بالا کلیات کی صورت میں حیدر قریشی کی کتابیں اس لنک سے لے سکتے ہیں۔

http://kuliat-library.blogspot.de/

حیدر قریشی کے فن کے حوالے سے مرتب کی گئی اور لکھی گئی کتابیں

اخبار وادبی رسائل کے نمبر اور گوشے اور یونیورسٹیوں کے دستیاب تحقیقی مقالات اس لنک پر

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

ادبی اعتراف

حیدر قریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔**حیدر قریشی فکروفن** مصنف:محمد وسیم انجم
(مطبوعہ۱۹۹۹ء)ناشر:انجم پبلشرز،کمال آباد نمبر۳،راولپنڈی۔پاکستان

۲۔**حیدر قریشی فن اور شخصیت**
مرتبین:نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے(مطبوعہ۲۰۰۲ء)
ناشر:اسباق پبلی کیشنز۔پُونہ،انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات**
مرتب:ڈاکٹر نذر خلیق(مطبوعہ۲۰۰۳ء)ناشر:میاں محمد بخش پبلشرز،خانپور،پاکستان

۴۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن**۔۔۔منزہ یاسمین کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں۔
اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ۔سال۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء
ناشر:میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔پاکستان

۵۔**حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز**
مرتب:سعید شباب(مطبوعہ۲۰۰۴ء) ناشر:نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ

۶۔**ادبی کتابی سلسلہ عکاس حیدر قریشی نمبر**۔۔۔مدیرومرتب:ارشد خالد
ناشر:عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد(کتاب نمبر۴۔مطبوعہ اکتوبر۲۰۰۵)

۷۔**حیدر قریشی کی شاعری** مرتب:ہردے بھانو پرتاپ
ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔(مطبوعہ۲۰۱۳ء)

۸۔**حیدر قریشی شخص و عکس** مدیرومرتب:ارشد خالد
ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد(۲۰۱۴)

۹۔**حیدر قریشی کا ادبی سفر** عامر سہیل کا ایم فل کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں
ناشر: سقراط بکس۔ایبٹ آباد۔۲۰۱۵ء

حیدر قریشی پر ترتیب دیئے گئے گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشۂ حیدر قریشی مطبوعہ **ماہنامہ ''اسباق'' پونہ** شمارہ:فروری تا اپریل۱۹۹۳ء۔ایڈیٹر:نذیر فتح پوری

۲۔حیدر قریشی(بطور افسانہ نگار)مطبوعہ **ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی**۔
شمارہ مئی تا دسمبر۱۹۹۷ء۔ہم عصر اردو ادب نمبر۔۔۔ ایڈیٹر : افتخار امام صدیقی

۳۔اشاعتِ خصوصی''دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ،حیدر قریشی''**ہفت روزہ ہوٹل ٹائمز اسلام آباد**۲۲مئی تا۲۸مئی ۱۹۹۸ا۔ مرتبین:اختر رضا کیکوٹی و محمد وسیم انجم

۴۔گوشۂ حیدر قریشی مطبوعہ **سہ ماہی ''ادبِ عالیہ'' وہاڑی**۔شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء۔ایڈیٹرز:ریاض ہانس

۵۔خصوصی مطالعہ''مہرِ امروز''،مطبوعہ **ماہنامہ کائنات** شمارہ مئی۲۰۰۴ء
(urdudost.com) ایڈیٹر:خورشید اقبال

۶۔گوشۂ حیدر قریشی مطبوعہ **ماہنامہ شاعر بمبئی** شمارہ نومبر۲۰۰۴ء۔ایڈیٹر:افتخار امام صدیقی

۷۔خصوصی مطالعہ **سہ ماہی ادب ساز دہلی**(تقریباً ۵۰صفحات میگزین سائز پر مشتمل)
شمارہ:۶،۷،جنوری تا جون ۲۰۰۸ء،ایڈیٹر:نصرت ظہیر

۸۔خصوصی مطالعہ **''عمرِ لاحاصل کا حاصل''**
مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد(کتاب نمبر۱۰) مدیر:ارشد خالد

۹۔گوشہ بحیثیت محقق و نقاد،مطبوعہ،ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد(کتاب نمبر۱۱،مئی۲۰۱۰ء)
مدیر:ارشد خالد

۱۰۔مطالعۂ خاص۔**ایک کتاب:''عمرِ لاحاصل کا حاصل''**۔
مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔کتاب نمبر۱۳۔مارچ۲۰۱۱ء۔مدیرومرتب:ارشد خالد

۱۱۔ایک گوشہ حیدر قریشی کے لیے۔دو صفحات پر مشتمل۔ **روزنامہ پیغام دہلی** شمارہ:۱۰ مئی ۲۰۱۴ء،
ایڈیٹر:مطیع الرحمٰن عزیز

۱۲۔''ایک گوشہ حیدر قریشی کی تحقیق و تنقید نگاری کے لیے''۔
مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل،اسلام آباد**،کتاب نمبر۲۸۔اپریل۲۰۱۸ء۔مدیرومرتب:ارشد خالد

حیدرقریشی سے متعلق اب تک ہونے والا یونیورسٹی سطح کا تحقیقی کام

۱۔حیدرقریشی شخصیت اورفن ۔۔۔۔منزہ یاسمین (**ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ** سال۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء)

(اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، پاکستان)

۲۔حیدرقریشی شخصیت اورادبی جہتیں ۔۔۔۔ڈاکٹرعبدالرب استاد (تحقیقی مقالہ برائے **پی ایچ ڈی** ۲۰۱۳ء)

(گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا)

۳۔حیدرقریشی۔حیات وخدمات انجم آراء (**ایم فل کا مقالہ** سال۲۰۱۳ء)

(کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا، انڈیا)

۴۔حیدرقریشی کی ادبی خدمات ۔۔۔۔عامرسہیل (تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو، ۲۰۱۴ء)

(ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، پاکستان)

۵۔حیدرقریشی کی شاعری کا مطالعہ۔۔۔ہردے بھانو پرتاپ (**ایم فل کا مقالہ**، سال۲۰۱۴ء)

(جواہرلال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا)

۶۔حیدرقریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ۔۔۔رضینہ خان (**ایم فل کا مقالہ** سال۲۰۱۴ء)

(جواہرلال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا)

۷۔حیدرقریشی کی شاعری کی روشنی میں بیرونی ممالک کی اردو شاعری۔''تنقیدی مطالعہ اور ترجمہ''

شعر المهجر عند حيدر قريشي ''دراسة تحليلية نقدية مع الترجمة''

احمد عبدربہ عباس عبدالمنعم (**ایم اے کا مقالہ** سال۲۰۱۵ء)۔**ازہر یونیورسٹی۔قاہرہ، مصر**

یہ مقالہ عربی میں لکھا گیا ہے اور اس کے لیے حیدرقریشی کے چار شعری مجموعوں کا عربی ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

۸۔مجلّہ ''جدید ادب'' کی ادبی خدمات'' از کنول تبسم (**ایم فل کا مقالہ**۔سال۲۰۱۸ء)

(وفاقی اردو یونیورسٹی۔اسلام آباد)

۹۔رسالہ ''جدید ادب'' کی ادبی خدمات۔تحقیقی وتنقیدی مطالعہ از محمد شعیب

ہزارہ یونیورسٹی۔مانسہرہ۔ (ایم فل کا مقالہ۔۲۰۱۸ء)

۱۰۔جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث ۔۔۔۔شازیہ حمیرہ **ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ**

سال۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور،

یونیورسٹی مقالات میں حیدرقریشی کا جزوی مگر اہم ذکر

۱۔اردو میں ماہیا نگاری از ڈاکٹر صبیحہ خورشید

سال۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی، ناگپور، انڈیا سے **پی ایچ ڈی کا مقالہ**

۲۔رحیم یارخان کے جدید شعراء کا تصورِ محبوب ازفرزانہ یاسمین

سال۲۰۱۷ء۔نیشنل کالج آف بزنس، ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور، **ایم فل کا مقالہ**

۳۔''ضلع رحیم یارخان کے شعراء گوہر ملسیانی، منور نقوی، حیدرقریشی کا خصوصی مطالعہ'' ازمحمد بلال قادر

ایم فل کا مقالہ۔نیشنل کالج آف بزنس، ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور

۴۔''خان پور میں اُردو غزل کی روایت کا تجزیاتی مطالعہ'' از نذیر بزمی

ایم فل کا مقالہ۔نیشنل کالج آف بزنس، ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور

۵۔اُردو میں میراجی شناسی کی روایت کا تجزیاتی مطالعہ ازساجدہ پروین **پی ایچ ڈی کا مقالہ**

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔اسلام آباد۔سال۲۰۱۴ء

۶۔''لالۂ صحرا''۔۔۔''ادب جہاں''۔۔۔''جدید ادب'' کی ادبی خدمات از ثنا اظہر

ایم فل کا مقالہ۔نیشنل کالج آف بزنس، ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور

حیدرقریشی کی کتب تک رسائی اور حیدرقریشی سے متعلق

ہونے والے کام تک رسائی کے لیے تین اہم اور آسان بلاگس

حیدرقریشی کی تمام کتابیں الگ الگ صورت میں:

http://my27books.blogspot.de/

حیدرقریشی کی تمام کتابیں پانچ کلیات کی صورت میں:

http://kuliat-library.blogspot.de/

اس لنک پر حیدرقریشی پر لکھی گئی، مرتب کی گئی کتب ورسائل کی پی ڈی ایف فائلز موجود ہیں

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/
